ماہنامہ
حکمتِ قرآن
لاہور

وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ
فِيْهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ
وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

(الحدید : ۲۵)

اور ہم نے لوہا اتارا

جس میں جنگ کی بڑی قوت ہے
اور لوگوں کے لیے بڑے فوائد بھی ہیں۔

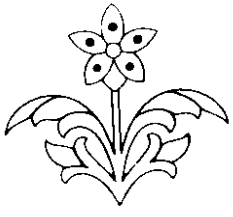

اتفاق فاؤنڈریز لمیٹڈ
۳۲ - ایمپریس روڈ - لاہور

وَمَن يُؤتَ الحِكمَةَ فَقَد اُوتِیَ خَیراً کَثِیراً

(البقرہ : ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاھور

جاری کردہ : ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی : ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر : حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

شمارہ : ۵	جولائی ۱۹۸۶ء مطابق ذوالقعدہ ۱۴۰۶ھ	جلد : ۵

—— یکے از مطبوعات ——

مرکزی انجمن خدام القرآن لاھور

۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن ۔ لاھور ۱۴

فون : ۸۵۲۶۱۱

کراچی آفس : ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بیکری، شاہراہِ لیاقت، کراچی (فون : ۲۱۶۵۸۶)

سالانہ زرِ تعاون ۔/۳۰ روپے —— فی شمارہ ۔/۳ روپے

مطبع : آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور

مضمون نگار حضرات کے آراء سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

فہرس

- حرفِ اوّل ——— ۳
  عاکف سعید
- درسِ قرآن ——— ۹
  سورۂ محمدؐ (دوسری قسط)
  ڈاکٹر اسرار احمد
- عبدیتِ کاملہ، حضورؐ کا منصبِ خاص ——— ۲۲
  مولانا اخلاق حسین قاسمی
- حضرت مجدد الف ثانیؒ ——— ۳۳
  برعظیم پاک و ہند میں باب تجدید کے فاتح
  مولانا سعید الرحمٰن علوی
- علامہ فضل حق خیر آبادی (آخری قسط) ——— ۴۱
  حکیم محمود احمد برکاتی
- سیرت و سوانح ——— ۴۹
  حضرت عبداللہ بن مبارکؒ (قسط ۲)
  نصرت علی اثیر
- رسول اللہؐ اور آپؐ کی تعلیمات کے بارے میں مستشرقینِ مغرب کا اندازِ فکر ۵۴
  عبدالقادر جیلانی
- تعارف و تبصرہ ——— ۶۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

گذشتہ شمارے میں قرآن اکیڈمی میں نئے داخلوں کے متعلق تفصیلی اعلان شائع ہوا تھا۔ الحمدللہ کہ حسبِ اعلان نئے داخلے عمل میں آچکے ہیں اور یکم جولائی سے بھرپور تدریس کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس وقت بیک وقت تین کلاسیں ساتھ ساتھ قرآن اکیڈمی میں چل رہی ہیں سال اوّل کی کلاس میں اصل زور عربی زبان کی تحصیل پر ہے۔ اللہ کا خصوصی فضل ہے کہ اس سلسلے میں ہمیں ایک نہایت باصلاحیت اور تجربہ کار استاذ جناب پروفیسر حافظ احمد یار صاحب کی خدمات حاصل ہیں جو نہایت جانفشانی سے تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔ موصوف پچھلے دو سال سے ہمارے ادارے سے منسلک ہیں اور ہم نے یہ محسوس کیا کہ اس دوران واقعۃً طلبہ میں عربی زبان سے لگاؤ پیدا ہوا ہے اور عربی سیکھنے کا شوق پروان چڑھا ہے اور بلاشبہ اس میں اصل کریڈٹ استاذ کو جاتا ہے۔ پہلے سال میں عربی کی تدریس کے ساتھ ساتھ ابتدائی فارسی اور تجوید کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ مزید برآں قرآن مجید کا ایک منتخب نصاب بھی سبقاً سبقاً پڑھایا جاتا ہے جس کے حوالے سے دین کا ایک جامع تصور اُجاگر ہو کر سامنے آتا ہے ـــ دوسرے سال کے نصاب میں پورے قرآن کا ترجمہ اور مشکوٰۃ المصابیح (مکمل) کے ساتھ ساتھ فقہ، اصولِ فقہ، اُصولِ حدیث، عربی ادب اور منطق کی بنیادی کتب بھی شامل ہیں ـــ اس سال سے ایسے طلبہ کے لئے جو دو سالہ تدریسی نصاب مکمل کر چکے ہوں، تیسرے سال کی تعلیم کا اہتمام بھی کیا گیا ہے اس تیسرے سال کے نصاب میں جامع ترمذی کے ساتھ ساتھ عربی زبان کے ذیل میں ادب جاہلی اور نحو کی بعض کتب شامل کی گئی ہیں ـــ ہماری خوش قسمتی ہے کہ مدرسین کی فہرست میں اس سال محترم مولانا الطاف الرحمٰن بنوی کا نام بھی شامل ہے۔ مزید یہ کہ اس سال سے جامعہ ابی بکر کراچی کے ایک قابل مدرس مولانا شبیر احمد صاحب نورانی کی خدمات بھی ہمیں حاصل ہیں۔ مولانا بنوی صاحب جہاں ہمارے متداول قدیمی طرز کے دینی مدارس سے فارغ التحصیل علماء میں ایک نمائندہ شخصیت اور نہایت باصلاحیت اُستاذ ہیں

تو وہاں مولانا نورانی جدید عربی اور علم حدیث میں خصوصی مہارت رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دینی مدارس کی بہت بڑی خدمت یہ ہے کہ ان کے ذریعے سے دینی علوم اور اسلاف کے ذخائرِ علمی معلّم و متعلّم کے رشتے سے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے ہوئے ہم تک پہنچے ہیں اور یہ کہنا ہرگز مبالغہ آمیزی نہیں ہے کہ دین کا ڈھانچہ جتنا کچھ سلامت ہے وہ انہی کارہینِ منّت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلاف کے نہج پر علم دین کی پیش قدمی کا کام اب ان دینی مدارس میں مفقود نا پید نظر آتا ہے تاہم ہمارے اسلاف کی میراثِ علمی کے وارث بہر طور یہی مدارس ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ علم دین کا جو کام بھی اسلاف کے طریق سے کٹ کر کیا جائے گا وہ یقیناً صراطِ مستقیم سے ہٹا ہوا ہوگا اور ہدایت کی بجائے کجی اور گمراہی کی جانب لے جائے گا۔

قرآن اکیڈمی میں دو سالہ دینی تدریسی نصاب کا آغاز آج سے دو سال قبل ہوا تھا۔ چنانچہ حال ہی میں ایک گروپ نے اس نصاب کی تکمیل کی ہے۔ پچھلے سال جب اس گروپ نے اپنی تعلیم کا ایک سال مکمل کیا تھا تو والد محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اُس پر مبنی ایک مفصل رپورٹ تحریر کی تھی جو اوّلاً ماہنامہ حکمت قرآن کی اشاعت مئی ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی تھی اور بعد ازاں اُسے الگ پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا گیا تھا۔ اُس کے آغاز میں والد محترم نے قرآن اکیڈمی کی فیلوشپ اسکیم اور دو سالہ تعلیمی نصاب کے پس منظر اور غرض و غایت کی وضاحت کرتے ہوئے یہ تحریر فرمایا تھا کہ :-

"مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۱۹۷۲ء میں قائم ہوئی تھی۔
اس کے پیشِ نظر جہاں (۱) "عربی زبان کی تعلیم و ترویج" (۲) قرآن مجید کے مطالعے کی عام ترغیب و تشویق" اور (۳) "علومِ قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت" ایسے **"عمومی مقاصد"** تھے وہاں (۴) "ایسے نوجوانوں کی مناسب تعلیم و تربیت جو تعلیم و تعلّم قرآن کو مقصد زندگی بنالیں" اور (۵) "ایک ایسی **"قرآن اکیڈمی"** کا قیام جو "قرآن حکیم کے فلسفہ و حکمت کو وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر پیش کر سکے" — ایسے **"معیّن منصوبے"** بھی تھے۔
قرآن اکیڈمی کا سنگِ بنیاد ۱۹۷۶ء میں رکھا گیا۔
پانچ سال کے عرصے میں تعمیرات کی معتد بہ حد تک تکمیل اور راقم الحروف اور

بعض رفقائے کار کی رہائش اور انجمن کے دفاتر کی منتقلی کے ابتدائی اقدامات کے بعد ۱۹۸۱ء میں متذکرہ بالا "معیّن ہدف" کی جانب پیشقدمی کا کا آغاز ہوا۔

چنانچہ ۱۹۸۱ء میں "قرآن اکیڈمی فیلوشپ اسکیم" کا اجرا ہوا جس میں ۷ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان تعلیم و تعلّم قرآن کے لئے پوری زندگی وقف کرنے کے عزم کے ساتھ شریک ہوئے"

"... راقم الحروف کے لئے یہ امر نہایت موجبِ اطمینان و امتنان ہے کہ قرآن حکیم کی ہدایت "قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا" اور دعوت و اصلاح کے عمل کے اصل الاصول یعنی "الاقدم فالاقدم" کے عین مطابق اور ایک انگریزی کہاوت "Charity begins at home" کے مصداق راقم کے دو فرزند بھی ان سات خوش قسمت نوجوانوں میں شامل ہیں۔

ان نوجوانوں کی دو سالہ تدریس کی تکمیل کے بعد محسوس ہوا کہ جذبہ اور خلوص کے باوصف تخلیقی و تحقیقی کام کی صلاحیت و اہلیت سب لوگوں میں نہیں ہوتی — چنانچہ اُن میں سے دو نوجوانوں کو تو اُن کی خواہش پر آزاد کر دیا گیا کہ وہ اپنے اپنے CAREERS کو جاری رکھتے ہوئے آزادانہ دین کی خدمت اور دعوت و تبلیغ میں اُس صلاحیت و استعداد کو بروئے کار لائیں جو انہیں دو سالہ تدریس سے حاصل ہوئی ہے۔ باقی پانچ نوجوان بحمداللہ مزید حصولِ علم کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے انجمن کے تحت دعوتی و تبلیغی، تدریسی و تعلیمی اور تنظیمی و انتظامی شعبوں میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

گذشتہ سال فیصلہ کیا گیا کہ پوری زندگی کو وقف کرنے کا عہد (COMMITMENT) لئے بغیر ذرا زیادہ تعداد میں نوجوانوں کو ایک دو سالہ تدریسی کورس میں شرکت کی دعوت دی جائے اور ضرورت ہو تو انہیں ان کے تعلیمی معیار کی مناسبت سے ماہانہ وظیفہ بھی دیا جائے۔ پھر ان میں سے جو لوگ تخلیقی و تحقیقی کام کی صلاحیت و استعداد کے حامل نظر آئیں انہیں مستقل فیلوشپ سکیم میں شامل کر لیا جائے۔ اس کے لئے اصلاً تو اُن ہی لوگوں کو ترغیب دلائی گئی جو ایک عرصے سے

راقم الحروف کے ساتھ وابستہ ہیں اور انجمن خدام القرآن یا تنظیم اسلامی میں سرگرم عمل ہیں لیکن ایک دعوتِ عمومی کے لئے اس اسکیم کی تشہیر اخبارات کے ذریعے بھی کی گئی ——— جس کے نتیجے میں اخبارات کے صفحات میں بعض حاسدین اور ناقدین کی جانب سے چہ میگوئی (CONTROVERCY) بھی شروع کی گئی جس کا بروقت جواب دے دیا گیا . . . ."

بحمد اللہ اس دو سالہ تدریسی کورس کے پہلے گروپ نے اس شعبان المعظم میں کورس مکمل کر لیا ہے لہٰذا اس کا ایک مختصر جائزہ پیش خدمت ہے۔

(۱) اس کورس کا آغاز چالیس شرکاء سے ہوا تھا۔ لیکن پہلے سال دوران سال مختلف اسباب کی بنا پر نو شرکاء ہمت ہار گئے تھے۔ ایک صاحب ایک ماہ کی تاخیر سے شامل ہوئے اس طرح پہلے تعلیمی سال کی تکمیل کرنے والے شرکاء کی تعداد بتیس تھی۔

(۲) ان میں ایک تقسیم اس اعتبار سے تھی کہ چالیس سال سے زائد عمر کے شرکاء چھ تھے، تیس اور چالیس سال کے مابین دس اور تیس سال سے کم عمر کے پندرہ۔

(۳) ایک دوسری تقسیم اس اعتبار سے تھی کہ ان میں سے انیس خود کفیل اور غیر موظف تھے۔ جبکہ صرف بارہ شرکاء کو مختلف مقداروں میں ماہانہ وظیفہ دیا گیا تھا۔

(۴) ان کی تعلیمی قابلیت کا چارٹ حسب ذیل تھا۔

ایم بی بی ایس	۲	بی ڈی ایس	۱
بی وی ایس سی	۱	چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ	۱
بی ایس سی انجینئرنگ (مکینکل)	۲	بی ایس سی، اے ایم آئی ای (سول)	۱
ایم ایس سی	۲	ایم اے	۳
بی ایس سی	۱	بی اے	۸
ایف اے	۴	مختلف ڈپلوما ہولڈرز	۵

اس گروپ کے مندرجہ ذیل شرکاء نے پہلے سال کی تکمیل کے بعد سلسلۂ تعلیم کو عارضی طور پر رخصت وغیرہ کی دشواریوں کے باعث منقطع کر دیا۔ امید ہے کہ یہ حضرات

ایک آدھ سال کے وقفہ کے بعد دوسرے سال کی تعلیم مکمل کرلیں گے۔

۱۔ ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ ۲۔ برادرم وقار احمد
۳۔ میاں محمد نعیم ۴۔ محمود عالم میاں
۵۔ چوہدری رحمت اللہ بٹر ۶۔ چوہدری محمد صادق
۷۔ اسد الرحمٰن فاروقی ۸۔ عبدالرزاق صاحب
۹۔ محمد اشرف بیگ ۱۰۔ میاں ساجد حمید
اور ۱۱۔ شکیل احمد صاحب

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل حضرات نے دوسرے سال بے قاعدگی سے شرکت کی:

۱۔ اشفاق احمد صاحب ۲۔ ڈاکٹر وقار احمد صاحب
۳۔ محمد افتخار تاج صاحب ۴۔ ڈاکٹر محمد اسلم قاضی

صرف دو شرکاء کو انتظامیہ نے فارغ کردیا: ایک محمد ارشد چیمہ کو امتحان کے نتائج کی بنیاد پر اور دوسرے محمد اشرف صاحب کو غیر تسلی بخش طرز عمل کی اساس پر۔

بقیہ پندرہ شرکاء نے بحمداللہ دوسالہ کورس کی بہ تمام وکمال تکمیل کرلی۔ اور آخری امتحان میں ان سب کے نتائج بھی بفضلہ تعالےٰ نہایت تسلی بخش رہے، ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

۱۔ میاں محمد رشید ۲۔ ڈاکٹر عبدالخالق
۳۔ اختر منیر خاں ۴۔ محمد سلیمان خان
۵۔ حافظ خالد محمود ۶۔ مختار احمد خان
۷۔ جاوید رفیق صاحب ۸۔ نعیم اختر صاحب
۹۔ شعیب الرحیم انصاری ۱۰۔ محمد غوری صدیقی
۱۱۔ غلام سلطان خاں ۱۲۔ کلیم الرحمٰن صاحب
۱۳۔ حمید احمد صاحب ۱۴۔ جاوید اسلم صاحب
۱۵۔ جناب محمد یامین

اس دو سالہ نصاب کے اختتام پر والد محترم نے مندرجہ بالا شرکاء کلاس کو اپنی رہائش گاہ پر دوپہر کے کھانے پر جمع کیا ۔ یہ گویا ایک سادہ سی الوداعی تقریب تھی جس میں آپ نے اُن سب کو کامیابی کے ساتھ دو سالہ تدریسی نصاب مکمل کرنے پر مبارکباد دی اور ساتھ ہی یہ فرمایا کہ اب یہ تعلیم آپ لوگوں پر حجت ہے، اس تعلیم کو اپنے قلوب واذہان میں جذب بھی کرنا ہوگا ۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اسے دوسروں تک پہنچانے کا کام بھی کرنا ہوگا ۔ اسی صورت میں اس کا حق کسی درجہ میں ادا ہو سکے گا اور اسی شکل میں دورانِ تعلیم کی گئی محنت کا کسی قدر ثمر آپ کو مل سکے گا ۔ محترم والد صاحب نے تاکیداً فرمایا کہ آپ میں سے ہر شخص عملی زندگی کے جس جس FIELD یا شعبہ سے متعلق ہے اب اُس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے رفقاءِ کار تک ان دینی تعلیمات کو پہنچائے ۔ جو اس نے ان دو برسوں میں حاصل کی ہیں ۔ یہی نہیں بلکہ جہاں کہیں بھی موقع ملے باقاعدہ درس وتدریس کا کام شروع کر دیجئے ۔ جو عربی پڑھا سکتا ہو وہ اپنے محلے یا دفتر میں شام کے اوقات میں عربی پڑھانے کا سامان کرے ۔ قس علی ذالک ۔ اس کے ساتھ ساتھ خود اپنے گھر والوں کی دینی تعلیم اور اصلاح کی کوشش بھی بھرپور طور پر ہونی چاہیئے ۔ گفتگو کے اختتام پر والد محترم نے انہیں یہ نوید بھی سنائی کہ اگرچہ ہم نے قرآن اکیڈمی میں سردست صرف دو سالہ نصاب پر پروگرام شروع کیا تھا لیکن اب الحمدللہ تیسرے سال کی کلاس کے اجراء کا فیصلہ بھی کر لیا گیا ہے ۔ جس میں اسی رُخ پر دینی تعلیم کو آگے بڑھاتے ہوئے علم حدیث اور عربی نحو وادب پر خصوصی توجہ دی جائے گی ۔

لہٰذا آپ میں سے جن حضرات کے لئے بھی ممکن ہو کہ وہ مزید ایک سال فارغ کر سکتے ہوں انہیں مزید اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیئے ۔ کھانے کے بعد یہ تقریب اپنے اختتام کو پہنچی ۔

درسِ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سورۃ محمد ﷺ

(قسط نمبر ۲)

ترتیب و تسوید: ——— شیخ جمیل الرحمٰن، حافظ عاکف سعید

نظمِ قرآن کے اعتبار سے گروپ بندی

اب آگے چلئے قرآن مجید کی سورتوں کی ایک گروپ بندی۔ ایک اور پہلو سے ہے اس کا تعلق قرآن فہمی، اس میں تدبّر اور سورتوں کے اندرونی نظم اور سورتوں کے باہمی ربط سے ہے۔ اس پر ہر دور میں کچھ نہ کچھ کام ہوا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسی بیسویں صدی میں اس پر ایک متقی و متدین شخصیت مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت عمیق تدبّر و تفکر کیا ہے، اور اس کے نظام اور باہمی ربط و تعلق کو واضح کرنے کے لئے انتہائی قابلِ قدر کام کیا ہے۔ مولانا فراہیؒ کے اصولوں پر نظمِ قرآن کو واضح کرنے کیلئے انہی کے شاگردِ رشید مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے مزید غور و فکر کیا اور ان کی نگاہ اور توجہ اس طرف منعطف ہوئی کہ قرآن مجید کی ترتیب میں جو یہ ربط ہے کہ پہلے چند مکی سورتیں ہیں پھر ایک یا ایک سے زائد مدنی سورتیں۔ پھر چند مکی سورتیں ہیں اور پھر چند مدنی سورتیں — تو آخر یہ کیوں ہے! ایسا کیوں نہیں ہے کہ پہلے تمام مکیات کو اور ان کے بعد جملہ مدنیات کو جمع کر دیا جاتا!! یقیناً اس ترتیب و ربط میں کوئی حکمت ہو گی۔ عربی زبان کی کہاوت ہے۔ فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ۔ یعنی "کسی بھی صاحبِ حکمت کا کوئی فعل بھی حکمت سے خالی نہیں ہوتا"۔ اور ظاہر ہے کہ صرف اللہ ہی کی ذات "الحکیم" ہے۔ پھر ہمیں یہ معلوم ہے کہ یہ ترتیب اور ربط

خود اللہ تعالیٰ نے قائم فرمایا ہے۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت جبریل علیہ السلام کی رہنمائی میں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موجودہ شکل میں قرآن مجید کو مرتب فرمایا ہے۔

جمع قرآن کے سلسلے میں بعض مغالطے اور اُن کا تدارک:

یہ مغالطے ذہن سے نکال دیجئے کہ موجودہ ترتیب دورِ خلافتِ راشدہ میں قائم ہوئی ہے۔ ان مغالطوں کے پیدا ہونے میں کچھ ہماری غلطی کو بھی دخل ہے۔ ہمارے خطباتِ جمعہ میں اکثر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام کے ساتھ 'جامع القرآن' کے الفاظ استعمال ہو جاتے ہیں حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ قرآن مجید کو حضرت عثمانؓ نے جمع نہیں کیا۔ اس کو اسلام کے کچھ دشمنوں خصوصاً صحابہ کرام کے دشمنوں نے غلط استعمال (Exploit) کیا ہے۔ ہماری صفوں میں بھی کچھ لوگ ایسے موجود ہیں جو اس قرآن مجید پر سے اعتماد کم کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ یہ تو مرتب ہی بعد میں ہوا ہے، اسے تو جمع کیا ہے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے۔ معاذ اللہ ایسا نہیں ہے۔ قرآن مجید مرتب کیا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضورؐ ہر رمضان میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کا دورہ فرمایا کرتے تھے۔ اگر مرتب نہیں تھا تو دورہ کس طرح ہوتا تھا! پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا جو آخری رمضان ہے، حدیث میں آتا ہے کہ اس میں حضورؐ نے دو مرتبہ حضرت جبرئیلؑ کے ساتھ قرآن مجید کا دورہ فرمایا تھا۔ تو اس وقت درحقیقت قرآن اسی شکل میں مرتب ہو گیا تھا جس شکل میں ہمارے سامنے ہے البتہ "مابین الدفتین"، یعنی کتابی صورت میں موجود نہیں تھا۔ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو ترتیب معلوم تھی کہ پہلے سورۃ فاتحہ ہے۔ پھر سورہ بقرہ ہے، پھر آل عمران ہے، پھر سورہ نساء ہے۔ اس طرح سورۃ الناس تک کی کامل ترتیب تمام اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم و رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے علم میں تھی۔ سب جانتے تھے کہ قرآن مجید کی یہی ترتیب ازل ہے اور لوحِ محفوظ کے مطابق ہے۔ یہ ضرور ہے کہ پورا قرآن مجید ایک کتابی شکل میں جمع شدہ موجود نہیں تھا۔ کتابی شکل میں جمعِ قرآن کا

کام بھی حضرتِ عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے دور میں نہیں ہوا بلکہ یہ کام حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں کرایا ہے ۔ یہ تو پہلی فرصت میں کیا جانے والا کام تھا ۔ یہ بارہ تیرہ سال پیچھے ڈالے جانے والی بات تو نہیں تھی ۔ حضرت عثمانؓ کا عہدِ خلافت تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے قریباً بارہ سال بعد شروع ہوا ہے ۔ جبکہ قرآن مجید کو ایک کتابی شکل میں مرتب کیے جانے کا کام خلافتِ صدیقی میں پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا ۔ اس ضمن میں حضرت عثمانؓ کا جو کارنامہ ہے، اس کا ذکر میں آگے کروں گا ۔

کتابی شکل میں قرآن مجید جمع کرنے کی ضرورت کا احساس

ہوا یہ کہ قرآن مجید تو اسی ترتیب سے صحابہ کرام رضی اللہ تعالےٰ عنہم کے سینوں میں محفوظ تھا ۔ بے شمار حفّاظِ قرآن مجید اللہ موجود تھے، لیکن دَورِ خلافتِ صدیقی میں مسیلمہ کذّاب کے خلاف یمامہ میں جو مقابلہ ہوا اس میں بہت سے حفاظ شہید ہوگئے، اغلباً ان کی تعداد ستر تھی ۔ لوگوں کو اعتماد تھا کہ قرآن مجید کتاب کی شکل میں موجود ہو یا نہ ہو، بے شمار حفّاظ کے سینوں میں تو محفوظ ہے ۔ یہ اندیشہ تھا ہی نہیں کہ قرآن مجید کا کوئی حصہ گم ہو جائے گا ۔ لیکن جب ایک ہی جنگ میں اتنی بڑی تعداد میں حفّاظ صحابہؓ شہید ہوگئے تو ایک بے چینی پیدا ہوئی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قرآن مجید ضائع ہو جائے ۔ لہٰذا ہمیں اُسے ایک کتاب کی صورت میں جمع کر لینا چاہیے ۔

جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی تو آنجنابؓ قدرے متذبذب و متامل (Reluctant) رہے کہ جو کام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نہیں کیا، میں کیسے کروں! لیکن جب اکابر صحابہ کرامؓ نے مشورہ دیا دلائل دیئے اور اس پر اصرار کیا تب حضرت ابو بکر صدّیقؓ نے یہ کام شروع کیا ۔ آنجنابؓ نے تمام کاتبینِ وحی کو جمع کر کے حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو ان کا ذمہ دار بنا کر یہ کام ان کے حوالے کر دیا ۔ لہٰذا مصحف کی شکل میں یعنی ما بین الدفتین صورت میں قرآن مجید دورِ خلافتِ صدیقی ہی میں جمع ہو چکا تھا ۔

حضرت عثمانؓ کا معاملہ

عرب کے مختلف مقامات میں عربی زبان کے لہجے مختلف تھے۔ آپ کو پتہ ہے کہ لہجہ میں کچھ الفاظ کے ہجے بھی بدل جاتے ہیں ۔ ایک ہی پنجابی زبان ہے، گوجرانوالہ کی اور ہے' لاہور کی اور ہے ۔ امرتسر کی اور تھی۔ ہم "امرتسر" بولتے ہیں وہاں "امبرسر" تھا۔ اسی نوع کا فرق اُس وقت عرب میں بھی علاقائی اعتبار سے موجود تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قبائل کی آسانی کے لئے اجازت دی تھی کہ جو تمہارا لہجہ ہے اُسی کے مطابق قرآن مجید پڑھ لیا کرو ۔ لیکن اس سے دور خلافت عثمانی میں یہ شکل سامنے آئی کہ لوگوں میں قرآن مجید کی مختلف قرآتیں پھیل گئیں ۔ لہذا حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالے عنہ نے قرائتوں کے فرق کو ختم کرنے کے لئے جمع شدہ قرآن مجید کے ایک لہجہ اور ایک قرأت پر اُمت کو جمع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنجنابؓ کے نام 'عثمان' اور ولدیت 'عفان' کے ساتھ ردیف لانے کے لئے ان کو 'جامع القرآن' کہہ دیا گیا۔ ورنہ وہؓ جامع القرآن نہیں ہیں بلکہ آنجنابؓ درحقیقت 'جامع الامّۃ علی القرآن' یعنی ایک لہجہ اور ایک قرأت پر امت کو جمع کرنے والے ہیں ۔ اور یہ بلا شبہ حضرت ذوالنورینؓ شہید مظلوم کا ایک عظیم کارنامہ ہے ۔ آپؓ نے حضرت حفصہؓ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور کے کتابی شکل میں جمع شدہ قرآن مجید کے سرکاری سطح پر چند نسخے تیار کرائے اور انہیں مختلف اہم شہروں میں بھیج دیا اس ہدایت کے ساتھ کہ قرأت اور لہجہ میں اب ان نسخوں کی پیروی کی جائے گی ۔ چنانچہ اُسی نسخہ کے مطابق قرآن نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا چلا آرہا ہے ۔ خود حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تیار کردہ نسخوں میں سے ایک نسخہ استنبول میں آج بھی موجود ہے' یہ نسخہ تو وہ ہے جس کی آنجنابؓ اُس وقت تلاوت فرما رہے تھے جب آپؓ کی شہادت ہوئی ہے اور ان کے خون کا دھبہ سورہ بقرہ کی آیت ۱۳۷ کے لفظ 'فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللهُ' پر آج بھی موجود ہے ۔ اسی طرح اُس دَور کا ایک نسخہ غالباً تاشقند میں بھی موجود ہے۔

ایک فتنہ

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اصل ترتیب، ترتیب نزولی ہے اور نزولی ترتیب والا قرآن حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے پاس تھا اور وُہی اصل قرآن تھا۔ اور اب وہ کسی امام غائب کے پاس ہے ۔ جو اُسے بغل میں دبائے

کسی غار کے اندر قریبًا ساڑھے تیرہ صدی سے بیٹھے ہیں اور جب وہ ظاہر ہوں گے۔ تب اصل قرآن سامنے آئے گا۔ یہ بات فتنہ ہے اور یہ بات جو شخص کہے گا۔ وہ انتہائی گمراہ ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ایسے شخص کے کفر میں ہرگز کوئی شک نہیں۔ اس لئے کہ یہ جان لیجئے کہ قرآن مجید کا معاملہ بنیادی ایمانیات میں سے ہے۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اصل قرآن صرف امام غائب کے پاس ہے یا یہ قرآن میں تحریف ہوگئی ہے تو یہ کفر کے مترادف ہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب ایسا عقیدہ رکھنے والوں سے تحقیق کی جاتی ہے تو وہ صاف کہہ دیتے ہیں کہ ہم یہ عقیدہ نہیں رکھتے۔ اس لئے کہ تقیہ ایسے لوگوں کی ڈھال ہے۔ چنانچہ ان پر تکفیر کا فتویٰ نہیں لگتا۔ ورنہ اگر کوئی گروہ ڈٹ کر یہ موقف اختیار کرلے تو اس پر اُسی طرح کفر کا فتویٰ لگے گا جیسے قادیانیوں کے کُفر پر علمائے اُمّت کا اجماع ہوا ہے۔ لیکن اگر وہ انکار کر دیں اور یہ کہہ دیں کہ ہمارا یہ موقف نہیں ہے تو اب کیا کریں! مفتی اور قاضی کو تو اعلان شدہ (Declare) موقف اور بیان پر فیصلہ دینا ہوتا ہے لہٰذا یہی وجہ ہے کہ اس گروہ کے کفر کا اجماعی فیصلہ تاحال نہیں ہوا۔ بہرحال میں نے اس وقت محض اشارتًا یہ بات عرض کی ہے ورنہ اصلاً یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔

مکّیات و مدنیات کی ترتیب

مَیں عرض کر رہا تھا کہ قرآن مجید میں مکّی اور مدنی سُورتوں کی جو ترتیب ہے۔ اس پر غور وتدبّر کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ بھی الل ٹپ یعنی بلا وجہ نہیں ہے معاذ اللہ ثم معاذ اللہ بلکہ اس میں بھی حکمت ہے۔ وہ یہ کہ قرآن مجید میں مکّیات اور مدنیات کی جو تقسیم ہے اُن پر غور کیا جائے تو مکّی و مدنی سُورتوں کے سات گروپ بن جاتے ہیں اور وہ اس طرح کہ ایک یا ایک سے زائد مکّی سورتیں اور ایک یا ایک سے زائد مدنی سورتیں انکو ملا کر ایک گروپ بن جاتا ہے مثلاً قرآن کی سب سے پہلی سورۃ یعنی سورۃ الفاتحہ مکّی ہے اُس کے بعد مسلسل چار سورتیں مدنی ہیں۔ یہ ایک گروپ ہوا۔ پھر سورۃ انعام اور اعراف مکی سورتیں ہیں جن کے بعد انفال اور توبہ مدنی سورتیں ہیں یہ دوسرا گروپ مکمل ہوا۔ یہ سلسلہ اسی طرح آگے بڑھتا ہے اور یوں کُل سات گروپ بن جاتے ہیں۔ پھر یہ کہ جس طرح ہر سُورت کا ایک مرکزی مضمون یا عمود ہوتا ہے۔ جس کے ساتھ اُس سُورت کی تمام آیات مربُوط ہوتی

ہیں اسی طرح ہر گروپ کا بھی ایک مرکزی مضمون ہوتا ہے اور اُس مرکزی مضمون کو اُس گروپ کی مکّی اور مدنی سورتیں مل کر مکمل کرتی ہیں ——— مکّی سُورتیں اس عمود کے ایک رُخ کو پیش کرتی ہیں، مدنی سورتیں اُسی کے دوسرے رُخ کو پیش کرتی ہیں ۔ اس طریقہ سے بھی قرآن مجید کی سورتوں کے جو سات گروپ بنتے ہیں۔ اُن کو قرآن مجید کے سات احزاب یا منازل کے ساتھ خلط ملط (CONFUSE) مت کیجئے گا ——— سات احزاب یا منازل کی تقسیم درحقیقت تلاوت کے لئے ہے اور یہ حجم میں قریباً مساوی ہیں۔ ان میں ایک ترتیب ہے جو میں اس سے قبل تفصیلاً بیان کر چکا ہوں ۔

بغرض تدبّر گروپس قرآن حکیم میں غور و فکر اور تدبّر کے لئے جو گروپس بنائے گئے ہیں ان میں آپ دیکھیں گے کہ سورتوں کی تعداد بھی مختلف ہے، حجم بھی مختلف ہے، اور مکّی و مدنی سورتوں کی شمولیت بھی مختلف اسلوب اور انداز سے کی گئی ہے مثلاً پہلے گروپ میں مکّی سُورت صرف ایک ہے اگرچہ وہ ایک سورت یعنی سورۃ فاتحہ بہت عظیم ہے، اُسے ام القرآن و اساس القرآن کہا گیا ہے، اور اس کے بعد مدنی سورتیں چار ہیں، سورہ بقرہ سے لے کر سورہ مائدہ تک ۔ جو قریباً سوا چھ پاروں پر پھیلی ہوئی ہیں ——— دوسرا گروپ سُورتوں کی تعداد کے اعتبار سے مساوی ہے ۔ دو سورتیں الانعام اور الاعراف مکّیات ہیں اور دو سُورتیں انفال و توبہ مدنیات ۔ اس کے بعد تیسرا گروپ شروع ہوتا ہے ۔ جو سورہ یونس سے لے کر سورۃ مومنون تک تو مکّیات پر مشتمل ہے لیکن اس گروپ کی آخری سورت مدنی ہے ۔ یعنی سورہ نور ۔ یہ پندرہ سورتوں کا گروپ بنتا ہے اور اسکا حجم چھ پاروں کے لگ بھگ ہے ——— آگے چلیئے چوتھے گروپ میں سورہ فرقان سے سورۃ السجدۃ تک آٹھ سورتیں مکّی ہیں پھر ایک سُورۃ سورۃ الاحزاب مدنی ہے ——— آگے چلیئے پانچواں گروپ شروع ہوا ۔ اس میں تیرہ سورتیں، سورۃ سبا سے لے کر سورۃ الاحقاف تک مکّی ہیں انہی میں سورۂ یٰسین ہے، انہی میں حوامیم ہیں یعنی جو سورتیں حٰمٓ سے شروع ہوتی ہیں ——— سورۃ الاحقاف حوامیم کے سلسلہ کی آخری سورت ہے اور بحمداللہ اس تک ہم تسلسل کے ساتھ قرآن مجید کا مطالعہ کر چکے ہیں ۔ اگرچہ اس مطالعہ اور درس کے مابین مختلف اوقات میں وقفے

آتے رہے ہیں - اس پانچویں گروپ کے آخر میں تین مدنیات شامل ہیں۔ یعنی سورۂ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، سورۃ الفتح اور سورۃ الحجرات - اوّل الذکر دو سورتیں جوڑے کی شکل میں ہیں اور آخر الذکر سورۃ اس جوڑے کا ضمیمہ یا اس کے مضامین کا تکملہ ہے اور آج ہم اللہ کے نام سے سُورہ محمدؐ سے تسلسل کے ساتھ مطالعہ و درس کا اعادہ کر رہے ہیں — سورۃ الحجرات کے بعد سورہ قٓ سے چھٹا گروپ شروع ہوتا ہے - یہ گروپ بھی قریبًا متوازن ہے - اس میں سورہ قٓ سے لے کر سورۃ الواقعہ تک سات مکیات اور سورۃ الحدید سے لے کر سورۃ التحریم تک دس مدنیات ہیں - اس طرح اس گروپ میں کل ۱۷ سورتیں شامل ہیں — پہلے گروپ میں سورۃ الفاتحہ صرف ایک مکی تھی اور چار مدنی سورتیں — اس کے بعد یہ چھٹا گروپ ہے جس میں مدنیات کی تعداد مکیات سے زیادہ ہے - اس کے بعد آخری اور ساتواں گروپ ہے جو سورۃ الملک سے شروع ہو کر سورۃ النّاس پر ختم ہوتا ہے - مکمل دو پارے — اس گروپ میں معدودے چند سُورتیں مدنی ہیں باقی سورتیں مکی ہیں — لہٰذا تدبّر کے مقصد کے لئے یہ سات گروپ بن جاتے ہیں - ہر گروپ کا ایک مرکزی مضمون یا عمود ہے - اس کا ایک رُخ مکی سُورتوں میں آتا ہے اور دوسرا رُخ مدنی سُورتوں میں اور اس طرح مِل جُل کر اس مرکزی مضمون کی تکمیل ہوتی ہے — بلکہ ایسے جیسے ہم کسی تصویر کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ اس کے دو رُخ ہوتے ہیں۔

تفسیر قرآن کے ضمن میں ایک مغالطہ کا ازالہ

تدبّر و تفہّم قرآن کے ضمن میں گروپنگ کے اس تذکرہ سے آپ کو کہیں یہ مغالطہ لاحق نہ ہو جائے کہ اگر یہ اتنی اہم بات تھی تو متقدمین کی توجہ اس طرف کیوں نہیں ہوئی! اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہمارے ذہنوں میں اپنے متقدمین کی طرف سے ایک سوئے ظن پیدا ہو جائے گا کہ شاید انہوں نے تدبّر قرآن کا حق ادا نہیں کیا — اس مخمصہ کو ذہن سے نکال دیجئے اس لئے کہ اس کے بالمقابل حضرت علی رضی اللہ تعالٰی عنہ سے مروی ایک طویل حدیث میں قرآن مجید کے بارے میں ہمیں یہ الفاظ ملتے ہیں :-

وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ — "علماء کبھی اس (قرآن) سے سیر
وَلَا يَخْلَقُ عَنْ كَثْرَةِ — نہ ہو سکیں گے، نہ کثرت و تکرار

الـــــدِ وَلاَ تنقضی عجائبہٗ ۔ تلاوت سے اس کے لطف میں کوئی کمی آتے گی اور نہ ہی اس کے عجائبات (یعنی نئے نئے علوم و معارف اور نئے نئے حِکم و اسرار) کا خزانہ کبھی ختم ہو سکے گا۔"

لہٰذا ظاہر بات ہے کہ قرآن مجید کے عجائب و غرائب اور اس کے نئے نئے پہلو ہمارے سامنے کیسے آتے اگر ہم یہ سمجھ لیتے کہ قرآن حکیم کے تمام مطالب، مفاہیم اس کے جملہ مضمرات و مقدّرات اور اس کے سارے مقتضیات و متضمنات متقدمین پر ختم ہو چکے ہیں۔ ظاہر بات ہے۔ کہ ہم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہیں! کیا امام رازیؒ کی تفسیر حرفِ آخر ہے! کیا امام زمخشریؒ کی تفسیر حرفِ آخر ہے! کیا علامہ آلوسیؒ پر تفسیر کا حق حرفِ آخر ہو گیا! ۔ ظاہر بات ہے کہ اگر ان میں سے کسی تفسیر کو حرفِ آخر مان لیا گیا ہوتا تو پھر بعد میں کوئی تفسیر لکھنے کی کوشش ہی نہیں کرتا کہ ہمارے متقدمین لکھ چکے ۔ ابن جریر طبریؒ سے زیادہ روایات کو کون جمع کرے گا! روائتی انداز کے اعتبار سے وہ تفسیر چوٹی کی ہے ۔ اسی طریق سے قدیم علم کلام کے اعتبار سے امام رازیؒ کی تفسیر کبیرؒ سے آگے کون جائے گا! ۔ وہ حرفِ آخر ہو جائے گی ۔ عربی نحو اور ادب کے لحاظ سے امام زمخشریؒ کی تفسیر کشاف، حرفِ آخر ہو جائے گی ۔ لیکن بات یہ نہیں ہے ۔ اچھی طرح جان لیجئے کہ قرآن حکیم کی کوئی تفسیر بھی حرفِ آخر ہو ہی نہیں سکتی ۔ یہ اللہ کا کلام ہے، اس کی گہرائیاں اتھاہ، اس کی وسعتیں ناپید اکنار ۔ اور یہ بات ہمیں اس حدیث سے معلوم ہوئی جس کا حوالہ پہلے آ چکا ہے۔

عجائب قرآنی کا ایک مظہر

ہر وہ شخص جو قرآن کو سمجھ کر پڑھتا ہے وہ اس مغالطے میں مبتلا ہو ہی نہیں سکتا کہ بس جو کچھ میں نے اس سے لینا تھا، وہ لے لیا ۔ قرآن کو ہر بار سمجھ کر پڑھنے والا شخص محسوس کرتا ہے کہ اگرچہ میں اس مقام سے پہلے کتنی مرتبہ گزرا لیکن اس میں معانی و مفاہیم اور ہدایت و معرفت کا جو خزانہ پوشیدہ ہے اس کے بعض پہلو ایسے تھے جن کی طرف پہلے میری توجہ نہیں ہوئی تھی ۔ اس ضمن میں امام شافعی رحمہ اللہ کا ایک واقعہ ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ خلافت راشدہ کے دور میں صحابہ کرامؓ کا کسی مسئلہ پر "اجماع" کی حجت اور سند ہونے کی دلیل انہیں قرآن سے مل جائے ۔ ان کے دل میں یہ خلش تھی جس کو

دور کرنے کے لئے وہ کہتے ہیں کہ میں نے تین سو بار اس کی تلاش میں قرآن مجید پڑھا لیکن دلیل نہ مل سکی - تین سو دیں بار جب پڑھ رہا تھا تو نگاہ سورہ نساء کی اس آیت کے اس حصہ پر ٹک گئی کہ :- وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۔ مسلمانوں کے راستہ سے ہٹ کر جو کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے گا تو پھر ہم اُسے دفع کریں گے، اُسے اسی (غلط) راستہ کے حوالے کر دیں گے جو اس نے اختیار کیا ہوگا اور اُسے جہنم میں جھونک دیں گے - معلوم ہوا کہ آیت کے اس حصہ سے وسبیل المومنین، یعنی اجماع امت کو بھی قرآن مجید کی رو سے سند کا درجہ حاصل ہو گیا اور اُسے بھی دین میں حجت ہونے کی دلیل قرآن مجید سے مل گئی - لہٰذا یہ بات جان لیجئے کہ قرآن مجید پر مستقل تدبر کرنے والے ہر شخص کو اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں حکمت وہدایت کے کتنے پہلو ہیں! - اس میں علوم ومعارف کے کتنے معدن پوشیدہ ہیں! جو کبھی ختم نہیں ہوں گے اور قرآن مجید ہر دور کے اُفق علمی پر خورشید تازہ کے مانند چمکتا رہے گا۔

قرآن کا اشاریہ بنانا ممکن نہیں ہے

اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ قرآن مجید کے مضامین کا Index (اشاریہ) بنانا ممکن ہی نہیں ہے - اس لئے کہ قرآن کی ایک ایک آیت میں حکمت وہدایت کے اتنے پہلو ہیں کہ بیک وقت ان کی معرفت اور احاطہ ناممکن ہے - یہ ایسی کتاب نہیں ہے جیسے دنیا کے قوانین کی کتابیں ہوتی ہیں کہ آپ نے دفعات معین کر دیں اور ضرورت کے وقت اشاریہ (Index) کے ذریعہ متعلقہ دفعہ نکال کر دیکھ لی - قرآن مجید کی ایک آیت میں بسا اوقات نہ صرف علم وحکمت کے بے شمار پہلو ہوتے ہیں بلکہ اس میں فلسفہ بھی ہوتا ہے، اخلاقیات سے متعلق ہدایت بھی ہوتی ہے، اس میں قانون کا کوئی پہلو بھی زیر بحث آجاتا ہے اب سوچئے کہ آپ اس کو Index میں کہاں کہاں درج کریں گے! پھر یہ کہ ایک آیت کے دس پہلو آپ کو کل تک معلوم تھے، گیارہواں آج آپ کے سامنے آگیا - آپ مزید تدبر کریں گے تو پھر ایک اور پہلو آپ کے سامنے آجائیگا لہٰذا قرآن حکیم کے مضامین کا کوئی ایسا Index بنانا ممکن نہیں ہے جو مکمل وجامع ہو - اور ان تمام مضامین اور تمام پہلوؤں کا احاطہ کرے جو قرآن حکیم میں زیر بحث آئے ہیں - یہ قرآن اللہ تعالیٰ کے علم کا مظہر کامل ہے، انسان کا ذہن اس کا کب احاطہ کر سکتا ہے!

یہ کلام ربانی ہے - اس کا کامل احصا انسان کے حیطۂ اختیار سے باہر ہے -

گروپوں کے اہم اور مرکزی مضامین

بہرحال میں نے قرآن حکیم کے مضامین کے اندرونی نظام کے متعلق جو بنیادی باتیں بیان کی ہیں، ان کو سامنے رکھ کر جب کوئی شخص قرآن مجید کا مطالعہ کرے گا اور آیات قرآنی میں غور و فکر اور تدبر کرے گا تو اُسے اندازہ ہو سکے گا کہ اس وقت وہ کس مقام پر ہے کون سا گروپ اُس کے زیر مطالعہ ہے! اس کا مرکزی مضمون یا عمود کیا ہے! اور اس پس منظر میں وہ نسبتاً بہتر طور پر قرآن پر تدبّر کا حق ادا کر سکے گا۔ اب میں چند گروپوں کے عمود کے بارے میں مختصر اشارات کروں گا - پہلے گروپ کا مرکزی مضمون ہے شریعت - سُورۃ فاتحہ میں بندہ اپنے پروردگار سے دُعا کرتا ہے - اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ - اس کے بعد سورہ بقرہ کا آغاز الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کے الفاظ سے ہوتا ہے کہ "یہ کتاب وہ ہے جس میں کوئی شک نہیں اس میں متقین کے لئے ہدایت ہے" - اور آپ کو معلوم ہے کہ سُورۂ بقرہ، سورۂ نساء اور سُورہ مائدہ میں اسی 'ہدایت' کی پوری شرح ہے چنانچہ ان سُورتوں میں شریعتِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے اہم شعبوں کی تکمیل ہو گئی - گویا اس گروپ کا اہم ترین موضوع شریعت ہے - اس گروپ کا دوسرا موضوع اہل کتاب پر اتمام حجّت ہے - اس ضمن میں ہم دیکھتے ہیں کہ سُورہ بقرہ میں یہود سے مفصّل گفتگو ہوئی اور سُورۂ آل عمران میں نصاریٰ سے - مزید یہ کہ سُورۂ نساء اور سُورۂ مائدہ میں بھی گاہے بگاہے اہل کتاب سے خطاب کیا گیا ہے - دوسرے گروپ میں دو مکّی اور دو مدنی سورتیں شامل ہیں اور اس گروپ کا مرکزی مضمون ہے مشرکین پر اتمام حجّت - سُورۃ انعام اور سورۂ اعراف دونوں کو آپ یک جا دیکھیں تو آپ محسوس کریں گے کہ ان میں وہ تمام مضامین جمع ہو گئے ہیں جو دوسری مکّی سُورتوں میں پھیلے ہوئے ملتے ہیں - لیکن ان دو مکّی سورتوں میں آکر وہ تمام مضامین یک جا ہو گئے ہیں گویا کہ آخری درجہ میں تمام مشرکین عرب پر اتمام حجّت کر دیا گیا ہے - یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد جو دو مدنی سُورتیں آتی ہیں وہ دراصل عذاب کی سُورتیں ہیں - غزوۂ بدر کا ذکر ہے سورہ انفال میں - یہ درحقیقت مشرکین عرب پر اللہ تعالےٰ کے عذاب کا پہلا کوڑا

تھا جو اس طور سے برسا کہ مشرکین کے ستر سرکردہ افراد میدان بدر میں کھیت رہے اور نقشہ کچھ یوں نظر آتا تھا کہ: كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۔ "گویا وہ کھجور کے درخت کے ڈھنڈ ہیں کھوکھلے جو کٹے پڑے ہیں"۔ یہ عذاب الٰہی کی پہلی قسط تھی جس کا ذکر سورہ انفال میں ہے ــــ اب آیئے سورۃ توبہ کی طرف۔ اس کے آغاز میں مشرکین پر اللہ کے عذاب کا ذکر ہے۔ بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ "اعلان برآت ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے"۔ اب ان مشرکین کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں ہوگا۔ آگے فرمایا گیا کہ ان کو چار مہینوں کی مہلت دی جا رہی ہے۔ اس میں فیصلہ کر لیں کہ وہ شرک کے اندھیروں میں رہنا چاہتے ہیں یا نورِ اسلام میں ــــ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ۔ اور مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اگر شرک چھوڑنے کیلئے تیار نہ ہوں تو ان کا قتل عام کرو ان کو جہاں پاؤ۔ البتہ استثنیٰ یہ ہے کہ

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ط

"اگر ان مشرکوں میں سے کوئی آپؐ سے پناہ طلب کرے تو اس کو پناہ اور امان دیجئے یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اُسے اس کے مقام پر پہنچا دیجئے"۔

ــــ تو بنو اسمٰعیل یا مشرکین عرب پر اتمام حجت ہوا سورہ انعام اور سورہ اعراف میں اور اس کے بعد ان پر عذاب اور سزا کا جو معاملہ ہے تو اس کا ذکر بعد کی دو مدنی سورتوں یعنی سورہ انفال اور سورہ توبہ میں ہے۔

محدود وقت کی وجہ سے میں جملہ گروپس (GROUPS) کے مرکزی مضمون یا عمود کو اس وقت بیان نہ کر سکوں گا۔ اب آیئے براہ راست اس سلسلے کے پانچویں گروپ کی طرف جس میں سورہ محمدؐ شامل ہے جو اس وقت زیر درس ہے۔

اس پانچویں گروپ میں تیرہ مکی اور تین مدنی سورتیں شامل ہیں، مکی سورتوں کا مطالعہ ہم مکمل کر چکے ہیں۔ اس سے قبل چوتھے گروپ میں آٹھ مکی سورتیں ہیں۔ ان مکیات کا مرکزی مضمون یا عمود توحید ہے۔ ان دونوں کو جمع کیجئے تو اکیس[۲۱] کا عدد بنا۔ اس

ہیں دس سورتیں اِدھر اور دس اُدھر۔ درمیان میں سورہ یٰسین ہے جس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کا قلب قرار دیا ہے اس سورۂ مبارکہ میں وہ کون سے امتیازی پہلو ہیں جن کے باعث نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قلب القرآن قرار دیا یہ ایک علیحدہ موضوع ہے اور اس سورۂ مبارکہ کے درس کے موقع پر میں اس پر قدرے تفصیل سے اظہار خیال کر چکا ہوں۔

بہر حال میں عرض کر رہا تھا کہ سورۂ فرقان سے لے کر سورۂ احقاف تک کی اکیس[۲۱] مکی سورتوں کا مرکزی مضمون توحید ہے۔ اب جو تین مدنی سورتیں آ رہی ہیں۔ آپ تقابل کریں گے تو ان میں آپ کو وہی ربط ملے گا جو دوسرے گروپ کی مدنی سورتوں میں تھا۔ سورۂ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جس کا دوسرا نام سورۂ قتال بھی ہے درحقیقت سورۂ بدر کی تمہید ہے۔ یہ سورہ غزوہ بدر سے پہلے نازل ہوئی ہے اور اس میں قتال کا آخری حکم آ گیا ہے۔ ہم ان شاء اللہ ان آیات کو اگلی نشست میں پڑھیں گے اور یہ عرض کرتا چلوں کہ یہ آیات مشکلات قرآن میں سے ہیں۔ ان پر منکرین حدیث و سنت نے بڑی طبع آزمائی کی ہے اور غلام احمد پرویز نے قتل مرتد اور لونڈی غلاموں کا جو مسئلہ اٹھایا تھا، اس میں انہی آیات کی غلط تعبیر و تاویل کرتے ہوئے اپنے باطل موقف کی بنیاد رکھی ہے۔ جب ہم وہ آیات پڑھیں گے۔ اللہ نے چاہا تو مسئلہ واضح اور منقح ہو کر سامنے آ جائے گا۔ اب اس نشست کے اختتام سے قبل دو امور مزید سمجھ لیجیے۔

پہلا یہ کہ سورۂ محمدؐ کے متعلق میں نے عرض کیا تھا کہ اس کا دوسرا نام، سورہ قتال بھی ہے تو یہ معاملہ اسی سورۂ مبارکہ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ قرآن کی متعدد سورتوں کے ایک سے زائد نام ہیں۔ سورہ فاتحہ کے تو بہت سے نام ہیں۔ اسی طرح سورۂ کافرون کے بھی۔ مزید یہ کہ سورہ توبہ کا دوسرا نام سورۂ برأت سورہ حٰمٓ السجدہ کا دوسرا نام سورۂ فصلت اور سورہ مومن کا دوسرا نام سورۂ غافر بھی ہے۔ اسی طرح سے ہمارے یہاں جو سورۃ سورۂ بنی اسرائیل، کے نام سے مشہور ہے، اس کا دوسرا نام سورۃ الاسرا بھی ہے۔ عرب دنیا میں یہ دوسرا نام ہی معروف و مشہور ہے۔ سورہ بنی اسرائیل کے نام سے وہ ناواقف ہیں۔ چنانچہ سعودی عرب کی حکومت نے قرآن مجید کا ایک پورا CONSIGNMENT (مرسلہ مال) اس بنا پر واپس کر دیا تھا۔ کہ اس میں سورۂ بنی

اسرائیل' کا نام اُن کے لئے غیر مانوس تھا ۔ چنانچہ عرب ممالک کے لئے ہمارے یہاں جو قرآن مجید طبع ہوتے ہیں ان میں سورہ بنی اسرائیل' کے بجائے سورۃ الاسرا' لکھا جاتا ہے۔ بہر حال بعض سورتوں کے ایک سے زائد نام ثابت ہیں جن میں سے ایک یہ سورہ محمد بھی ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کا دوسرا نام سورہ قتال غالباً اس وجہ سے ہے کہ اس کی بیسویں آیت میں آخری حکم قتال آتا ہے ۔ جبکہ اذن قتال سورہ حج میں وارد ہوا ہے اور اسکی فرضیت کا تمہیدی بیان ہے سورہ بقرہ میں : كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ ۔ لیکن ابھی تک کوئی جنگ ہوئی نہیں تھی ۔ اب بدر کے میدان میں بالفعل جنگ ہونے والی تھی ۔ لہٰذا اس غزوہ سے متصلاً قبل یہ سورہ محمدؐ نازل ہوئی اور اس میں قتال کے تفصیلی احکام دیدیئے گئے ۔

دوسری بات یہ کہ سورہ انفال غزوہ بدر سے متعلق تھی اور اس کے معاً بعد سورہ توبہ تھی جو انقلاب محمدیؐ کے آخری دور کے واقعات سے متعلق ہے ۔ اس میں مشرکین سے اعلان برأت ان کو چار ماہ کی مہلت ،سفر تبوک کے حالات اس موقع پر منافقین کے طرز عمل اور غزوہ حنین کے واقعات کا بیان ہے ۔ بالکل وہی ربط ان دو سورتوں میں ہے ۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ سورہ محمدؐ غزوہ بدر سے متصلاً قبل نازل ہوئی ہے اور اس میں قتال کا واضح حکم آیا ہے اور سورہ فتح ۶ھ میں نازل ہوئی ہے صلح حدیبیہ کے متصلاً بعد جسے قرآن فتح مبین قرار دیتا ہے ۔ میں آج سوچ رہا تھا ۔ کہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہمارے اور اللہ تعالےٰ کے پیمانے کتنے مختلف ہیں ۔ ہم اس دنیا کی ظاہری فتح کو دیکھتے ہیں اور اللہ تعالےٰ کے علم میں جملہ ظاہری و باطنی حالات ہیں ۔ ہمارے نزدیک فتح مکہ بہت اہم واقعہ ہے حالانکہ پورے قرآن میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے ۔ ہمارے نزدیک یہ بہت بڑا اور عظیم الشان واقعہ ہے اور ہم اسے سیرت مطہرہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا بڑا اہم باب قرار دیتے ہیں اور یقیناً یہ نہایت اہم واقعہ ہے لیکن مجھے کوئی بتائے کہ قرآن مجید میں اس کا کہیں ذکر ہے ! دوسری جانب صلح حدیبیہ کے بارے میں لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ صلح دب کر کی گئی گویا کہ ہماری شکست ہو گئی لیکن اس صلح کے متصلاً بعد وہ سورت نازل ہوئی جو سورہ محمدؐ کے بعد ہے یعنی سورہ فتح جس کا آغاز ہوتا ہے : اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا سے ۔ اللہ تعالےٰ نے حدیبیہ کی صلح اور عاہدہ کو فتح مبین قرار دیا ۔ تو جو وہاں ربط ہے سورہ انفال اور سورۂ توبہ میں بالکل

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

اخلاق حسین قاسمی
مہتمم جامعہ رحیمیہ دہلی

عبدیتِ کاملہ: حضورؐ کا منصبِ خاص

یوں تو خدا تعالیٰ نے اپنے تمام رسولوں کو عبدیت کی صفت سے یاد کیا ہے، لیکن رسولِ آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو جس انداز سے عَبْد کہہ کر پکارا ہے وہ انداز یہ بتا رہا ہے کہ صفتِ عبدیت آپؐ کا خصوصی وصف اور ممتاز منصب ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکار کے جتنے اہم مواقع قرآن کریم میں موجود ہیں ان تمام موقعوں پر خداوند عالم نے آپ کو عبدیت کی صفت سے ہی یاد فرمایا ہے۔

(۱) الفرقان یعنی قرآن کریم کے نزول کا ذکر کیا تو عَلٰی عَبْدِہٖ ـــــ فرمایا۔
(الفرقان نمبر ۱)

(۲) مقامِ اسراء و معراج کا ذکر کیا تو ـــــ بِعَبْدِہٖ ـــــ کہہ کر اس داستانِ حقیقت کو بیان کیا۔ (سورہ اسراء نمبر ۱)

(۳) آیاتِ بیّنات اور معجزات کا ذکر کیا تو ـــــ عَلٰی عَبْدِہٖ ـــــ فرمایا
(الحدید : ۹)

(۴) آپؐ کی عبادت کا ذکر کیا تو ـــــ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰہِ ـــــ فرمایا۔
(الجن : ۱۹)

(۵) معراج کے موقعہ پر جو رازدارانہ ہمکلامی ہوئی اس میں ـــــ فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَا اَوْحٰی ـــــ فرمایا۔ (النجم ۱۰)

(۶) دشمنوں کے مقابلہ میں اپنی غیبی امداد کا اعلان اسی وصفِ خاص کے ساتھ کیا۔
ـــــ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ ـــــ (الزمر : ۳۶)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی صفتِ عبدیت کے ساتھ اپنی نبوّت کا اقرار کرایا
اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے جدید علم کلام کی اپنی مشہور کتاب "آبِ حیات" میں لکھا ہے کہ عبدیتِ مطلقہ (عبدیتِ کاملہ) حضور اکرم کا منصبِ خاص ہے اور اس منصب میں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام آپؐ کے نائب ہیں۔

حضرت نانوتوی کے اس نظریہ کی روشنی میں قرآن کریم اور احادیث صحیحہ کا گہرا مطالعہ اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ عبدیتِ نبویؐ کا وصف چند حقائق کا اعلان کرتا ہے :

(۱) عبدیت ـــــ اخلاقی نقطہ نظر سے آپ کی تواضع اور کسرِ نفسی کا اظہار ہے

(۲) عبدیت ـــــ دینی نقطہ نظر سے تکمیلِ دین کا اعلان

(۳) عبدیت ـــــ سیاسی نقطہ نگاہ سے شورائی خلافت کے آغاز کا اعلان ہے۔

(۴) عبدیت ـــــ علامہ اقبال کی عارفانہ نکتہ آفرینی میں حضور کے لئے کمال محبوبیت کا اعلان ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبدیت تواضع اور کسرِ نفسی کے مفہوم میں آپ کی پوری اخلاقی زندگی میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

اس موقع پر اس کی تفصیل میں نہیں جانا۔

اسی طرح عبدیتِ کاملہ سے تکمیلِ دین کا مفہوم بھی واضح طور پر سمجھ میں آتا ہے۔ عبدِ کامل یعنی کامل فرمانبردار وہی ہو سکتا ہے جس کے پاس عبادت و عبودیت کے کامل احکام و فرمان موجود ہوں۔

اور آپؐ کے پاس خدا کا آخری اور مکمّل دین موجود تھا جس کی تعمیل نے آپؐ کے اسوۂ حسنہ کو انسانوں کے لئے زندگی گذارنے کا مکمّل نمونہ بنا دیا۔

اسی وصفِ خاص کو قرآن کریم نے ـــــ اوّل المؤمنین ـــــ کے لقب سے پیش کیا ہے۔ اور شاہ عبدالقادر صاحب محدّث دہلوی کے ترجمہ کے مطابق اوّلیت سے اوّلیت رتبی (مرتبہ کی اوّلیت و فضیلت) کی طرف اشارہ ہے۔

دوسرے علماء تفسیر نے اوّلیت سے اوّلیتِ زمانی مراد لی ہے۔

عبدیت کی مذکورہ چار تفسیروں میں بعد کی دو تفسیریں زیادہ غور طلب ہیں۔ آیئے

ان پر غور کریں۔

عبدیت کا سیاسی پہلو

عبدیت سے سیاسی نظام اسلامی کی شورائیت پر استدلال مشہور فلسفی مفسر امام فخر الدین رازی (متوفی ۶۰۶ھ) نے کیا اور پھر امام کے بعد حافظ ابن کثیر دمشقی (متوفی ۷۷۴ھ) نے اس کی مزید وضاحت کی۔ اس استدلال کی بنیاد حضرت سلیمان علیہ السلام کی مشہور دعا اور خدا تعالیٰ کی طرف سے اس دعا کی قبولیت کے الفاظ ربانی ہیں:

حضرت سلیمان کی دعا یہ ہے:-

رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَهَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ

(ترجمہ) اے پروردگار! معاف فرما، مجھے ایسی سلطنت دے جو میرے بعد (یا میرے سوا) کسی کے لائق نہ ہو۔ بے شک تو اصل داتا ہے۔

حضرت سلیمان کی یہ دعا اس شکل میں قبول ہوئی کہ ہوائیں اور جنات ان کے تابع فرمان کر دیئے گئے۔

پھر اس عظیم سلطنت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت حق تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام سے فرمایا:

هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَیْرِ حِسَابٍ

(ترجمہ) یہ ہماری خاص عطاء و انعام ہے۔ اے سلیمان! اسے دو یا روک کر رکھو، تم پر کوئی گرفت نہیں۔

محقق ابن کثیر نے اس کی تفسیر میں یہ عبارت تحریر کی،

ای هٰذا الذی اعطیناك من الملك التام والسلطان الكامل كما سألتنا فاعط من شئت و امنع من شئت فهو صواب۔

(ترجمہ) اے سلمان! یہ مکمل اقتدار اور کامل سلطنت ہم نے تم کو عطا کی جیسا کہ تم نے سوال کیا تھا۔ پس جس کو چاہو دو، جس کو چاہو محروم کر دو، تم پر کوئی داروگیر نہیں، یعنی تم جو بھی کرو، وہ تمہارے لئے جائز ہے اور تم جو فیصلہ کرو وہ درست ہے۔

اس کے بعد صحیحین کی حدیث نقل کرتے ہیں۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما خیر بین ان یکون عبدا رسولا وھو الذی یفعل ما بعد بہ وانما ھو قاسم یقسم بین الناس کما امرہ اللہ تعالیٰ بہ وبین ان یکون نبیاً ملکاً یعطی من یشا ویمنع من یشا بلا حساب ولا جناح (ابن کثیر جلد ۴ صفحہ ۳۹)

(ترجمہ) خدا تعالیٰ نے حضورؐ کو اختیار دیا کہ وہ عبد رسول کا مقام اختیار کریں یا عبد ملک کا عبد رسول وہ ہے جو حکم الٰہی کے مطابق چلے اور لوگوں کے درمیان ـــــ علم و دولت ـــــ تقسیم کرے، حکم الٰہی کے مطابق۔ عبد ملک وہ ہے جس کو چاہے دے اور جسے چاہے نہ دے اس پر نہ کوئی حساب کتاب ہے اور نہ داروگیر ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا منصب اختیار کر لیا۔

اس کے بعد ابن کثیر فیصلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

پہلا مقام ـــــ عبدیت والی رسالت ـــــ خدا کے نزدیک ارفع و اعلیٰ ہے اگرچہ دوسرا مقام ـــــ ملوکیت والی رسالت ـــــ بھی دنیا اور آخرت میں عظیم المرتبت ہے ـــــ

علامہ ابن کثیر نے یہ بتایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مختار بادشاہی کے مقابلہ میں نیابت الٰہیہ کا منصب اختیار کیا۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم خلیفۃ اللہ تھے، حکم الٰہی کے تحت آپ اپنے رفقار سے مشورہ لینے کے لئے مامور تھے ـــــ وشاورھم فی الامر ـــــ

مشورہ اور شوریٰ کی اہمیت قرآن کریم کی تعلیمات کی خصوصیات میں داخل ہے، کسی آسمانی کتاب میں اس کی اہمیت موجود نہیں۔ اور نہ کسی پیغمبر کی زندگی کے واقعات میں مشورہ کی اتنی اہمیت نظر آتی ہے ـــــ

اس تفسیر پر اشکال علامہ ابن کثیر اور امام رازی کی اس تفسیر پر ایک اشکال وارد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا اور اس کے جواب سے ملوکانہ خود مختاری کا جواز ـــــ بلکہ فضیلت بھی ـــــ ثابت ہوتی ہے۔ حالانکہ دین توحید

۔۔۔۔۔جو تمام رسولوں کا دین تھا ۔۔۔۔ کسی انسان کی خود مختاری کو اور بااختیار ملوکیت کے تصور کو توحید کے منافی قرار دیتا ہے ۔

اس دنیا میں ہر انسان، خواہ وہ حکمران ہو یا ایک عام آدمی ۔۔۔ مالک حقیقی کی عطا کی ہوئی دولت علم وزر کا امین ہے ۔ نگران ہے، مالک نہیں ۔

ملکیت کا تصور ۔۔ قارونی تصور ہے جو اس نے حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں پیش کیا تھا ۔ احسن کما احسن اللہ علیک ۔۔۔۔ کے جواب میں کہتا ہے ۔۔۔ انما اوتیتہٗ علی علم عندی ۔۔۔ یہ دولت و اقتدار میرے علم و ہنر کا ثمرہ ہے ۔ کسی کا احسان نہیں ہے ۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے حضرت آدم سے لے کر حضرت یوسف، طالوت حضرت داؤد و سلیمان ۔۔۔۔ سب خدا کے مقرر کردہ تھے، روحانی اور اخلاقی رہنمائی اور اجتماعی اور سیاسی قیادت پر مامور کئے گئے تھے ۔

حضور علیہ السلام بھی مالک حقیقی کی طرف سے مامور و مقرر ہوئے ۔ چونکہ آپ آخری مامور من اللہ تھے اور آپ کے بعد خدا کی طرف سے تقرر و ماموریت کا سلسلہ ختم ہو رہا تھا ۔ اس لیے اب شوریٰ کی اہمیت لازمی تھی ۔

چنانچہ آپ نے اپنے بعد اپنے جانشین کے انتخاب کا معاملہ شوریٰ کے سپرد کر دیا ۔ کیونکہ آپ کو اپنی طرف سے تقرر کا حق نہیں دیا گیا تھا ۔۔۔۔۔ اس طرح اب مکمل معنی میں شوریٰ کے دور کا آغاز ہوا ۔

ان قدمائے مفسرین کی تشریح کے مطابق بعد کے علماء تفسیر نے بھی اسی کے مطابق تفسیر کی اور یہ اشکال اور زیادہ واضح ہو گیا ۔

مولانا اشرف علی تھانوی کے الفاظ یہ ہیں :۔

"دوسرے سلاطین مال و دولت کے محض امین و خازن ہوتے ہیں لیکن حضرت سلیمانؑ کو اس مال و دولت کا مالک بنایا گیا ۔ (بیان القرآن سورہ ص)

مفتی محمد شفیع صاحب نے معارف القرآن میں اس اشکال کو محسوس کیا اور ان الفاظ میں اس کی وضاحت فرمائی ۔

"عام حالات میں سیاسی اقتدار اور مال و دولت کی ایسی طلب کو پسندیدہ نہیں کہا گیا ۔

حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے لیکن اگر اقتدار کا مقصد حق کی سربلندی ہو تو یہ دعا مطلوب حق بن جاتی ہے۔" (خلاصہ معارف جلد ۷ صد ۵۱۹)

مولانا شبیر احمد عثمانی کے ہاں اس کا تسلی بخش جواب ملتا ہے۔ مولانا نے لکھا:

"حضرت سلیمان علیہ السلام کا زمانہ جابر بادشاہوں کا زمانہ تھا۔ آپ نے دین حق کی سربلندی کے لیے یہ معجزہ طلب کیا اور یہ کہ حکومت کی دعا کی جو جابر بادشاہوں کا سر غرور جھکا دے ــــ اور ایسا ہی ہوا۔" (حمائل ۵۱۱)

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی نے اپنے مختصر تفسیری حاشیہ میں اس اشکال کو دور کرنے کے لیے یہ لکھا۔

"یہ اور مہربانی کی کہ اتنی دنیا دی اور مختار کر دیا، معاف کر کر، لیکن وہ کھاتے تھے اپنی ہاتھ کی محنت سے ٹوکری بنا کر۔" (سر ۳۹ پارہ ۲۳ پر حاشیہ)

شاہ صاحب نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہر معجزہ یا کرامت بھی ہوتا ہے ــ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خوش حالی کے فتنہ اور تموّل کی آزمائش سے بچنے کے لیے ایک مزدور بندہ کی طرح ذاتی زندگی گذاری۔

آپ فرمایا کرتے تھے: هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ لِیَبْلُوَنِیْ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ــــ یہ میرے رب کا فضل و کرم ہے۔ وہ مجھے آزمانا چاہتا ہے کہ میں شکر گزاری کی زندگی گذارتا ہوں یا ناشکری کی زندگی ــــ

مودودی صاحب کی تاویل

بہرحال اب زیر غور مسئلہ کی طرف آیئے ــــ زیر غور آیات کی جو تفسیر جمہور مفسرین نے کی ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اس سے مطمئن نظر نہیں آتے۔

مودودی صاحب نے دعا سلیمان کی جو تاویل کی وہ حسب ذیل ہے:

ان کے دل میں (حضرت سلیمان کے) غالباً یہ خواہش تھی کہ ان کے بعد ان کا بیٹا جانشین ہو اور حکومت انہی کی نسل میں رہے ــــ لیکن جس بیٹے کو وہ اپنی کرسی پر بٹھانا چاہتے تھے وہ کندۂ ناتراش تھا ــــ جس کا اجسام نام تھا۔ تب انہوں نے اس خواہش سے رجوع کیا اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ کر درخواست کی کہ بس یہ بادشاہی مجھی پر ختم ہو جائے۔ میں اپنے بعد اپنی نسل میں

بادشاہی باری رہنے کی تمنا سے باز آیا ۔ (مختصر تفہیم القرآن ۸۴۷)

آئیے اس تاویل کا تجزیہ کریں ۔

(۱) سب سے پہلے قرآنی الفاظ اور سیاق و سباق لیجئے

قرآن کریم میں لا احد من بعدی کے الفاظ عام ہیں اگر حضرت سلیمان اپنے بیٹے کے لئے یہ دعا ـــــ جو درحقیقت بددعا ہے ـــــ کرنا چاہتے تھے تو اس کا جواب واضح طور پر یہ ہوتا کہ اے سلیمان! ہم نے تمہاری دعا قبول کی اور یہ عظیم سلطنت تم پر ختم ہو جائیگی

لیکن قرآن کریم کا جواب دوسرا ہے ـــــ ھذا عطاء نا...... الخ

اللہ تعالے نے وہ دعا سلیمان کی زندگی میں ہی قبول فرمائی ـــــ اور اسے اپنا خاص عطیہ قرار دیا ۔

(۲) حدیث صحیح میں آتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شیطان کو گرفتار کرنے سے گریز کیا، جبکہ وہ ایک رات حضورؐ کی نماز میں خلل ڈالنے کی کوشش کرنے لگا۔ صبح اٹھ کر آپؐ نے فرمایا

رات کو ایسا واقعہ پیش آیا، میں شیطان کو پکڑ کر باندھ دیتا مگر مجھے اپنے بھائی سلیمان کی دعا ـــــ رب ھب لی ملکًا ....الخ ـــــ یاد آگئی ۔

فذکرت دعوۃ اخی سلیمان ـــــ اور میں نے شیطان کو چھوڑ دیا ۔

(بخاری کتاب الانبیاء)

حضورؐ کا مطلب یہ تھا کہ جنات اور شیاطین پر قدرت، یہ حضرت سلیمان کی خاص فضیلت تھی۔ جس کی انہوں نے اس دعا میں طلب کی تھی ۔ میں بطور معجزہ شیطان کو پکڑ سکتا تھا لیکن لوگوں کو میرے اس جزوی واقعہ سے غلط فہمی پیدا ہوتی، اس لئے میں نے ایسا نہیں کیا ۔ ـــــ اس سے دعا سلیمان کا مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت سلیمان زندگی میں ایک مثالی اقتدار کے طالب ہوئے ـــــ

مودودی صاحب نے بائبل کے حوالے سے یہ تاویل کی ہے لیکن توراۃ میں اس کی تصریح موجود ہے کہ حضرت سلیمان کے بعد ان کا بیٹا جانشین ہوا ۔

"سلیمان کی مدت کہ سلیمان نے یروشلم پر حکومت کی چالیس برس کی تھی اور سلیمان اپنے باپ دادا کے ساتھ سو رہا اور ان کے شہر صیہون میں گاڑھ دیا گیا اور اس کا بیٹا

احتمام اس کی جگہ بادشاہ ہوا۔"

(قصص القرآن جلد ۴ ص۲۷ بحوالہ سلاطین باب، آیات ۲۲-۴۲)

اللہ غریق رحمت کرے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو، مرحوم اس تاویل میں بہت آگے نکل گئے۔ لیکن جہاں تک اس تاویل کے منشاء و محرک کا سوال ہے تو وہ نہایت پاکیزہ ہے اور وہ عقیدۂ توحید کی حفاظت کا جذبہ ہے۔

ایک خالص توحیدی ذوق پر یہ تصور گراں گذرتا ہے کہ ایک داعیٔ توحید نبی و رسول اپنے لئے ملوکانہ اقتدار کا سوال کرے اور خدا تعالیٰ اسے وہ عطا بھی فرما دے۔

مودودی صاحب کے ذوق نے معجزہ کے طور پر بھی اسے تسلیم نہیں کیا۔

اسے زبردست احتیاط پسندی ہی کہنا چاہیئے ______

یہ بحث ہمیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی ملتی ہے۔ آپؐ کے لئے قرآن کریم نے کہا ____ النبی اولی بالمومنین من انفسھم (احزاب ۶)۔ اس آیت میں اہل ایمان کی جانوں پر رسول پاکؐ کی ولایت کا اعلان کیا گیا ہے۔

شاہ ولی اللہ نے اولیٰ کا ترجمہ متصرف کیا ہے ____ پھر اس مفہوم کی بنیاد پر مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے آبِ حیات میں حضورؐ کی مالکیت کا مستقل فلسفہ مرتب کیا اور آپؐ کے لئے دوسرے درجہ کی مالکیت کی اصطلاح وضع کی اور پھر یہی تصور زیادہ پھیل کر ایک طبقہ کے ہاں حضورؐ کے مالک و مختار ہونے کے عقیدہ میں ڈھل گیا۔

لیکن شاہ ولی اللہ صاحب کے دوسرے صاحبزادوں نے ابہام شرک سے آیت کے مفہوم کو بچانے کے لئے۔ متصرف کے لفظ سے گریز کیا،

شاہ رفیع الدین صاحب نے اولیٰ کا ترجمہ شفقت (محبت) کیا اور شاہ عبدالقادر صاحب نے ____ لگاؤ ____ ترجمہ کیا۔

لغت عربی میں ولادیت کا یہ مفہوم بھی آتا ہے ____

شاہ عبدالقادر صاحب نے تفسیری حاشیہ میں اپنے والد کے لفظ متصرف کا مطلب واضح کرتے ہوئے لکھا ____

"نبی نائب ہے اللہ کا، اپنی جان و مال میں اپنا تصرف نہیں چلتا، جتنا نبی کا کا چلتا ہے۔"

یعنی نبی کا تصرف نائب خدا کی حیثیت سے ہے اور نائب کا تصرف مالکِ حقیقی ہی کا تصرف ہوتا ہے۔ اسی کے حکم کے تحت ہوتا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے اولیٰ کا تیسرا مفہوم اختیار کیا اور اس کا ترجمہ "مقدم ہے" کا لفظ لکھا — اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے تھانوی صاحب کی پیروی اختیار کی اور لفظ مقدم کے مطابق ترجمہ کیا۔

عبدیتِ رسولؐ، علامہ اقبال کے ہاں !!

علامہ اقبالؒ نے عبدیتِ رسولؐ کی تشریح ایک عارفانہ پیرایہ میں کی ہے، فرماتے ہیں:

عبدِ دیگر، عبدہٗ چیزے دگر ما سراپا انتظار، او منتظر !!

شارح اقبالیات نے اس کا مطلب یہ لکھا ہے کہ ہماری عبدیت یہ ہے کہ ہم سراپا طلب ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سراپا مطلوب ہیں۔

علامہ نے شریعت کی ایک خاص اصطلاح کو عشق و محبت کی جس تعبیر میں بیان کیا ہے اس پر بڑی دلچسپ بحث چھڑ سکتی ہے۔

مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت علی اور حضرت عمر کے درمیان کون افضل ہے۔ شاہ صاحب بڑے حاضر جواب اور ذہین تھے۔ آپ نے عقلی اور نقلی — دونوں قسم کی دلیلوں سے دامن بچا کر محبت کی اصطلاح میں جواب دیا۔ اور فرمایا:

"حضرت علی مرید تھے اور حضرت عمر مراد تھے"

یعنی حضرت علی طالب تھے خود حق کی طرف آئے اور حضرت عمر مطلوب تھے انہیں حق کی طرف لایا گیا۔

شاہ صاحب نے اس دعا کی طرف اشارہ کیا جس میں رسولِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کے اسلام قبول کرنے کی دعا کی تھی۔

شاہ صاحب کا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے حضرت عمرؓ کی فضیلت حضرت علی پر بیان فرمائی۔

شاہ صاحب نے تصوّف کی جس اصطلاح میں جواب دیا اسی اصطلاح کے مطابق شاہ صاحب کے جواب پر تنقید کی گئی ہے ۔

طریقت و محبت کی دنیا کے امام مولانا جلال الدین رومی ہیں۔ مولانا نے مثنوی میں مرید و مراد اور طالب و مطلوب کے باطنی رشتہ کی گرہ کشائی کرتے ہوئے فرمایا :

ہیچ عاشق خود نباشد وصل جو — کہ نہ معشوقش بود جویای او
میلِ معشوقاں نہانست و ستیر — میلِ عاشق باد و صد طبل و نفیر

کوئی عاشق وصل کی جستجو اسی وقت کرتا ہے جب معشوق کے اندر جستجو پیدا ہوتی ہے ۔ فرق اتنا ہے کہ معشوق کی طلب پوشیدہ ہوتی ہے اور عاشق کی طلب غل شور مچاتی ہوئی آتی ہے ۔

اردو کے سب سے پہلے شاعر ولی دکنی نے عشق و حسن کے باطنی رشتہ کا ان لفظوں میں اظہار کیا ہے ۔ ولی کہتا ہے :

عشق بے تابِ جاں گدازی ہے — حُسن مشتاق دل نوازی ہے ۔!

دلی کے صوفی مزاج شاعر مخمور دہلوی نے نہایت سادہ زبان اور عام فہم پیرایہ میں کہا ہے ۔

میری طلب بھی انہی کے کرم کا صدقہ ہے — یہ آگ لگتی نہیں ہے، لگائی جاتی ہے

حیدر دہلوی جواب کراچی میں آسودۂ رحمت ہیں فرماتے ہیں اور اپنے خاص البیلے انداز میں فرماتے ہیں ؎

جمال خود ہیں تو دیکھ اپنا جنونِ الفت سے اڑنے والے
میرا گریباں پھٹا ہوا ہے یا پھٹ پڑا ہے شباب تیرا!

اب فیصلہ کیجیے کہ طالب و مطلوب میں کیا فرق رہا۔ مرید اور مراد میں کسے افضل کہا جائے ؟

علامہ اقبال تو ایک عارفانہ نکتہ بیان کر کے چلے گئے لیکن مسئلہ وہیں کا وہیں رہا ۔

اصحابِ شریعت نے عبدیتِ رسولؐ کی جو تشریح کی وہ ہر طرح کے ردّ و قدح سے پاک ہے ۔

لفظ عبد کے ترجمہ میں احتیاط

جب یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عبد کا لفظ بطور اصطلاح ایک خاص مفہوم میں بولا گیا ہے تو ضروری ہوا کہ اس لفظ کے ترجمہ میں اس کا لحاظ رکھا جائے۔ اہل تراجم خواہ فارسی والے ہوں یا اردو والے اس حقیقت کو سمجھتے ہیں اور اسی لئے اس لفظ کا ترجمہ "بندہ" کرتے ہیں۔ "غلام" نہیں کرتے۔

بندہ فارسی کا لفظ ہے۔ فارسی میں بندگی کے دو معنی آتے ہیں، کامل فرماں برداری اور غلامی ـــــ اہل تراجم نے پہلے مفہوم میں عبد کا ترجمہ بندہ کیا۔

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے عبد سے عبد کامل، فرد کامل مراد لے کر اس لفظ کا ترجمہ "بندۂ خاص" کیا ہے اور یہ بہت اچھا ترجمہ ہے جس میں مولانا تھانوی منفرد نظر آتے ہیں[1]

اَلرَّسُوْل بھی اصطلاحی لفظ ہے قرآن کریم نے عبد کی طرح رسول پاک کے لئے "الرسول" کا لفظ بھی لغوی معنی میں استعمال نہیں کیا بلکہ اصطلاحی مفہوم میں سے استعمال کیا ہے۔

قرآن کریم نے الرسول کا لفظ جس جامع مفہوم میں استعمال کیا ہے وہ یہ ہے:

(۱) زبان سے خدا کا پیغام سنانے والا۔ یہ تبلیغ ہے (المائدہ ۶۷)

(۲) اپنے عمل و فعل سے سمجھانے اور یقین دلانے والا، یہ شہادت ہے (الحج ۷۸)

(۳) خدا کے پیغام کی تشریح اور تفسیر کرنے والا، اسے تبیین کہتے ہیں (النحل ۴۴)

غور کیجئے!

کسی عجمی زبان میں الرسول کے اصطلاحی لفظ کا ترجمہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اہل تراجم میں سے شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی نے الرسول کا ترجمہ کسی فارسی اردو یا عربی لفظ سے نہیں کیا ـــــ یہ شاہ صاحب کی الہامی اور وہبی قرآن فہمی کا کمال ہے

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

---

[1] عبد کی چھ آیتوں میں سے پانچ آیتوں میں بندۂ خاص لکھا۔ صرف ایک آیت (اسراء) میں اس کا خیال نہیں رہا

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

برِّعظیم پاک و ہند میں بابِ تجدید کے فاتح

حضرت مجدّد الفِ ثانی

رحمتہ اللہ علیہ

"صدیاں گزر گئیں، عشاق کے ذکر میں آج یہ تاثیر ہے تو ان کی پاک صورتوں، روحوں کی گہرائیوں اور دلربائیوں کا کیا حال ہوگا۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد رح)

آج انہی عشاق میں سے ایک ایسے مردِ حق شناس، بلند ہمت اور صاحبِ عزیمت کا ذکر کرنے کے لیے قلم اٹھایا گیا ہے، جس کی قبرِ انور پر کھڑے ہو کر اقبال مرحوم نے یوں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ؎

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر — وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار
اِس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے — اِس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے — جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان — اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

(بالِ جبریل)

اور جس کی عظمتوں اور رفعتوں کا ذکر کرتے ہوئے "ڈاکٹر آرنلڈ" اپنی کتاب "پریچنگ آف اسلام" میں رقم طراز ہیں:

"شہنشاہ جہانگیر (۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۹ء) کے عہد میں ایک سنی عالم شیخ احمد مجدد نامی تھے جو شیعی عقائد کی تردید میں خاص طور پر مشہور تھے۔ شیعوں کو اس وقت دربار میں رسوخ حاصل تھا۔ ان لوگوں نے کسی بہانے انہیں قید کرا دیا۔ دو برس وہ قید میں رہے اور اس مدت میں انہوں نے اپنے رفقائے زندان میں سے سینکڑوں بت پرستوں کو اسلام کا حلقہ بگوش بنا لیا۔"

ص ۱۳۹ طبع ثالث

اللہ اللہ کتنی صحیح اور درست شہادت ہے مقامِ مجدد پر، اعداء کی طرف سے۔

الفضل ما شهدت به الاعداء

اس سے آگے بڑھیں "انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن اینڈ ایتھکس" میں ہے کہ:

"ہندوستان میں سترہویں صدی میں ایک عالم جن کا نام شیخ احمد مجدد تھا۔ جو ناحق قید کردیئے گئے تھے، ان کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے اپنے قید خانے کے ساتھیوں میں سے کئی سو بت پرستوں کو مسلمان بنا لیا۔" (ص ۴۸، جلد ۶)

یہ تذکرہ ہے اس صاحبِ عزیمت کا جس سے سازشی عناصر کے بہکانے پر جہانگیر بادشاہ سرِ دربار سجدہ کی توقع کیے ہوئے ہے لیکن وہ ایوان صدارت میں داخل ہوکر بلاخوف وخطر نہایت ہی پُر اعتماد اور پُر وقار لہجہ میں مغل بادشاہ کو مخاطب کرکے کہتے ہیں:۔ "بجز خلاقِ جہاں کسی اور کو سجدہ روا نہیں اور اے جہانگیر کیا یہ کھلی ایک ہوئی سفاہت وحماقت نہیں کہ میں اپنے ہی جیسے ایک مجبور و بے بس انسان کے آگے جھکوں۔"

اور جہانگیر ان کا منہ تکتا رہ گیا۔ اسے سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس گدڑی پوش فقیر کا کیا کرے؟ آخر وہ جھنجھلا کر سزائے موت کا حکم صادر کرتا ہے لیکن گویا کہ اس حکم پر اسے کسی غیبی طاقت نے جھنجھوڑا، وہ فوری طور پر اس سزا کو منسوخ کرکے عمر قید کا حکم دیتا ہے اور حضرت شیخ کو "اجین" کے قلعہ "گوالیار" میں نظر بند کردیا جاتا ہے جہاں سینکڑوں اخلاقی قیدی موجود ہیں۔ اس نرالے قیدی اور جرمِ حق گوئی کے مجرم کے پہنچنے سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں؟ وہی جن کا ذکر آپ نے سطور بالا میں پڑھا ہے میرا جی چاہتا ہے کہ رئیس المجددین کی مبارک زندگی پر ذرا تفصیلی روشنی ڈالوں، کیا عجب کہ اس مردِ قلندر و دانا کے توسط سے دادرِ محشر کی عدالت میں روسیاہی سے بچ جاؤں۔ میرے یہ جملے بلاوجہ نہیں، حضرت مجدد اپنے رسالہ "مبدٔ و معاد" میں تحدیث نعمت کے تحت ارقام فرماتے ہیں:۔

"ایک روز حلقۂ احباب میں بیٹھا تھا کہ اپنی خرابیاں اس حد تک سامنے آنے لگیں کہ فقر و درویشی سے ذرا مناسبت معلوم نہ ہوتی تھی، اسی اثناء میں

حدیث نبوی "من تواضع للہ رفعہ اللہ" کے موافق اس دور افتادہ کو خاکِ ذلت سے اُٹھایا گیا اور یکبارگی دل میں یہ آواز سنائی دی "غفرت لک ولمن توسل بک الی بواسطۃ اوبغیر واسطۃ الی یوم القیامۃ" اس مضمون کو بار بار فرما کر مجھے نوازا اور اس حد تک کہ شک و شبہ کی قطعاً گنجائش نہ رہی۔ اور اس کے بعد اس الہام کے ظاہر کرنے پر مجھے مامور کیا ؎

اگر بادشاہ بر در پیر زن بیاید تو اے خواجہ سبلت مکن

شانِ مجدّدیت

حقیقت تو یہ ہے کہ بقول حضرت مولانا قاری محمد طیّب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند آپ کا "مجدّد الف ثانی" ہونا ہی عظمت و رفعت کی ایسی دلیل ہے کہ لا مزید علیہ۔

جی چاہتا ہے کہ قاری صاحب موصوف کے ارشادات نقل کرکے "مقامِ مجدّد الف ثانی" کو واضح کر دیا جائے۔

پڑھیے اور سر دھنیے:

"حضرت مجدد صاحب کی تاریخی حیثیت سے کتنی ہی طویل و عریض سوانح لکھ لی جائے لیکن ساری سوانح حیات کی وہ روح جس سے ان کی ذاتِ گرامی دنیا میں آفتاب بن کر چمکی اور آج بھی اپنے اندر وہی جذب مقناطیسی کا اثر رکھتی ہے، صرف ایک ہی صفت جمیلہ ہے جو ان کے اس لقب "مجدّد" سے نمایاں ہے۔ کسی ذات کو "مجدّد" مان لینا اس کے غیر معمولی کمالات علمیہ و عملیہ کا اقرار کر لینا ہے۔ کیونکہ تجدیدِ دین کا منصب اصلی تو انبیاء علیہم السّلام کا ہے اور پھر اس میدان کے مرد وہ ہیں جو نبوت کے ترکہ کے وارث بن کر اس سے کوئی غیر معمولی حصہ پائیں۔ پس جس طرح کسی ذات کو نبی مان لینے سے اس کے لیے تمام بشری کمالات کا اقرار خود بخود لازم ہو جاتا ہے، اسی طرح کسی کو مجدّد تسلیم کر لئے جانے سے اس میں وراثتِ نبوّت کے غیر معمولی خطوط کا اعتراف بھی خود بخود ہی لازم ہو جاتا ہے۔ منصبِ نبوّت

اللہ اللہ کتنی صحیح اور درست شہادت ہے مقامِ مجدد پر، اعداء کی طرف سے۔

والفضل ما شهدت به الاعداء

اس سے آگے بڑھیں "انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس" میں ہے کہ:

"ہندوستان میں سترہویں صدی میں ایک عالم جن کا نام شیخ احمد مجدد تھا۔ جو ناحق قید کردیئے گئے تھے، ان کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے اپنے قید خانے کے ساتھیوں میں سے کئی سو بت پرستوں کو مسلمان بنا لیا۔" (ص۴۹، جلد ۶)

یہ تذکرہ ہے اس صاحبِ عزیمت کا جس سے سازشی عناصر کے بہکانے پر جہانگیر بادشاہ سرِ دربار سجدہ کی توقع کیے ہوئے ہے لیکن وہ ایوان صدارت میں داخل ہوکر بلا خوف و خطر نہایت ہی پُر اعتماد اور پُروقار لہجہ میں مغل بادشاہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:۔ "بجز خلاقِ جہاں کسی اور کو سجدہ روا نہیں اور اے جہانگیر کیا یہ کھلی ایک

ہوئی سفاہت و حماقت نہیں کہ میں اپنے ہی جیسے ایک مجبور و بے بس انسان کے آگے جھکوں۔"

اور جہانگیر ان کا منہ تکتا رہ گیا۔ اسے سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس گدڑی پوش فقیر کا کیا کرے؟ آخر وہ جھنجھلا کر سزائے موت کا حکم صادر کرتا ہے لیکن گویا کہ اس حکم پر اسے کسی غیبی طاقت نے جھنجھوڑا، وہ فوری طور پر اس سزا کو منسوخ کرکے عمر قید کا حکم دیتا ہے اور حضرت شیخ کو "اجین" کے قلعہ "گوالیار" میں نظربند کردیا جاتا ہے جہاں سینکڑوں اخلاقی قیدی موجود ہیں۔ اس نرالے قیدی اور جرمِ حق گوئی کے مجرم کے پہنچنے سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں؟ وہی جن کا ذکر آپ نے سطور بالا میں پڑھا ہے میرا جی چاہتا ہے کہ امام المجددین کی مبارک زندگی پر ذرا تفصیل روشنی ڈالوں، کیا عجب کہ اس مردِ قلندر و دانا کے توسط سے داورِ محشر کی عدالت میں روسیاہی سے بچ جاؤں۔ میرے یہ جملے بلا وجہ نہیں، حضرت مجدد اپنے رسالہ "مبدء و معاد" میں تحدیث نعمت کے تحت ارقام فرماتے ہیں:۔

"ایک روز حلقۂ احباب میں بیٹھا تھا کہ اپنی خرابیاں اس حد تک سامنے آنے لگیں کہ فقر و درویشی سے ذرا مناسبت معلوم نہ ہوتی تھی، اسی اثناء میں

حدیث نبوی " من تواضع للّٰہ رفعہ اللّٰہ " کے موافق اس دور افتادہ کو خاکِ ذلت سے اٹھا یا گیا اور یکبارگی دل میں یہ آواز سنائی دی " غفرت لک ولمن توسل بک الی بواسطۃ او بغیر واسطۃ الی یوم القیامۃ " اس مضمون کو بار بار فرما کر مجھے نوازا اور اس حد تک کہ شک وشبہ کی قطعاً گنجائش نہ رہی ۔ اور اس کے بعد اس الہام کے ظاہر کرنے پر مجھے مامور کیا ؎

اگر بادشاہ بر در پیرزن بیاید تو اے خواجہ سلت مکن

شانِ مجدّدیت

حقیقت تو یہ ہے کہ بقول حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند آپؒ مجدد الف ثانی ہونا ہی عظمت ورفعت کی ایسی دلیل ہے کہ لامزید علیہ ۔
جی چاہتا ہے کہ قاری صاحب موصوف کے ارشادات نقل کر کے " مقامِ مجددیت والف ثانی " کو واضح کر دیا جائے ۔
پڑھیئے اور سر دُھنیئے :

" حضرت مجدد صاحب کی تاریخی حیثیت سے کتنی ہی طویل و عریض سوانح لکھی جائے لیکن ساری سوانح حیات کی وہ روح جس سے ان کی ذاتِ گرامی دنیا میں آفتاب بن کر چمکی اور آج بھی اپنے اندر وہی جذب مقناطیسی کا اثر رکھتی ہے ، صرف ایک ہی صفت جمیلہ ہے جو ان کے اس لقب " مجدد " سے نمایاں ہے ۔ کسی ذات کو " مجدد " مان لینا اس کے غیر معمولی کمالات علمیہ وعملیہ کا اقرار کر لینا ہے ۔ کیونکہ تجدید دین کا منصب اصلی تو انبیاء علیہم السلام کا ہے اور پھر اس میدان کے مرد وہ ہیں جو نبوت کے ترکہ کے وارث بن کر اس سے کوئی غیر معمولی حصہ پائیں ۔ پس جس طرح کسی ذات کو نبی مان لینے سے اس کے سب تمام بشری کمالات کا اقرار خود بخود لازم ہو جاتا ہے ، اسی طرح کسی کو مجدد تسلیم کرئے جانے سے اس میں وراثتِ نبوت کے غیر معمولی خطوط کا اعتراف بھی خود بخود ہی لازم ہو جاتا ہے ۔ منصبِ نبوت

سے عہدۂ مجددیت کی اِس نسبت ہی کا یہ اثر ہے کہ جس طرح انبیاء علیہم السلام کو یہ منصبِ جلیل کسی اپنی شخصی جد و جہد یا کسی اجتماعی یا جماعتی تجویز سے نہیں ملتا اسی طرح مجددوں کو بھی عہدۂ تجدید نہ ان کی اپنی ذاتی جانفشانی و محنت سے ہاتھ آتا ہے نہ کسی جماعت کے من سمجھوتہ سے! بلکہ یہ محض من اللہ ایک موہبتِ عظمیٰ ہوتی ہے جس کے لیے غیبی انتخاب سے افراد چن لیے جاتے ہیں اور مخلوق کے دلوں میں ان کی مقبولیت خود بخود قائم کر دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح قرآن کریم نے انبیائے کرام کے لیے "بعثت من اللہ" کا لفظ اختیار کیا ہے جیسے "هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ" الآیہ یا جیسے "حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا" یا جیسے "بَعَثْنَا إِلَيْهِمْ رُسُلًا" وغیرہ ٹھیک اسی طرح حدیث نبوی نے مجددوں کے لیے بھی یہی "بعثت من اللہ" کا کلمہ اختیار کیا ہے، ارشاد نبوی ہے "ان اللہ یبعث لھذہ الامۃ علی راس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا (مشکوٰۃ)

اور جیسے قرآن کریم نے "نبی" کا انتخاب من اللہ بتلایا ہے۔ "اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ" ایسے ہی اس حدیث میں "مجدد" کی بعثت بھی "إِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ" فرمایا گیا ہے، جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان دونوں منصبوں کا انتخاب من جانب اللہ ہی ہوتا ہے۔ فرق اگر ہے تو یہ کہ "نبوت" اصل ہے اور "تجدید" اس کا ظل ہے، وہاں "الہام" قطعی ہے جس کو "وحی" کہتے ہیں۔ یہاں ظنی ہے اُس کا منکر خارج از اسلام ہے اِس کا منکر خارج از سلامتِ ذوق ہے، بہرصورت "مجددیت"، "نبوت" کا ایک نہایت ہی روشن اور درخشاں پرتو ہے، اسی لیے مجدد علم و عمل کے لحاظ سے نبی کا سایہ اور اخلاق و ملکات کے لحاظ سے نبی کا نمونہ ہوتا ہے، پس "مجدد" کہہ لینے کے بعد کسی اور منقبت کا درجہ ہی نہیں رہتا کہ جس کے ذریعے "مجدد" کی تعریف کی جائے، اور اگر کی جائے گی تو وہ اسی وصف تجدید کی تفصیل

ہوگی۔ جس کا "من" لفظ "مجدد" ہوگا۔ پس اگر حضرت مجدد صاحب
مسلمہ مجدد ہیں اور ضرور ہیں تو ان کی ہمہ منقبت یہی ہے کہ وہ
مجدد ہیں اور "الف ثانی" کے مجدد ہیں۔"

آگے چلیں اور "الف ثانی" کے متعلق سنیں، یہاں بھی مضمون قاری صاحب کا ہے لیکن ہم نے بخوفِ طوالت تلخیص کر دی ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

"الف ثانی (دوسرا ہزارہ) کا آغاز امت کے حق میں تمام اگلے پچھلے فتنوں کا فتح باب تھا کیونکہ امت کی خیریت ختم ہو جانے سے متعلق حضور ختمی مرتبت فداہ روحی وجسدی کے دو ارشاد ہیں۔ یعنی "پانچ سو سال" اور "ہزار سال"، جیسا کہ دونوں روایات احادیث میں موجود ہیں اور اربابِ نظر سے مخفی نہیں کہ پانچ صدیاں گذر جانے پر "فتنہ تاتار" نے جو تہلکہ مچایا اس سے نہ صرف "خیریتِ امت"، بلکہ جہان سے مسلمانوں کا اور ان کی شوکت وقوت کا استیصال ہو چکا تھا لیکن محافظِ حقیقی نے بالآخر انہی تاتاریوں کے دلوں کو مائل بہ اسلام کیا اور وہ قبولِ اسلام پر مجبور ہو گئے اور اسی پر بس نہیں بلکہ "خلافتِ عثمانیہ" کا سنگِ بنیاد رکھ کر اسلام کی وکالت شروع کر دی۔ ؎

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

اور حقیقت میں یہ قصرِ خلافت نہیں بلکہ قصرِ امت کا سنگ بنیاد تھا۔ پس قلبِ نبوی پر یہ فتنہ منکشف ہوا تو آپ نے امت کی عمر پانچ سو سال ارشاد فرمائی۔ چھٹی صدی سے گویا امت کی تعمیرِ نو شروع ہوئی اور اس کے علوم و کمالات کی اشاعت کا ایک بہترین دور شروع ہوا۔ لیکن پھر دس صدیوں کے اختتام تک جو حالت ہوئی اور جس طرح ملی قدریں پامال ہوئیں، مسلمان زبوں حالی کا شکار ہوا۔ تخریبی قوتوں نے جس عیاری و مکاری سے ملتِ اسلامیہ کی جدید بنیادوں میں تزلزل پیدا کیا اور بالخصوص ہندوستان میں "بابر" سے لے کر "اکبر" تک مخصوص حالات

کے پیشِ نظر جس انتہائی ناگفتہ بہ اور ملت کش تحریک نے جنم لیا اس کی تفصیلات سے کلیجہ منہ کو آتا ہے، اور طوالت کا بھی خطرہ ہے، اس لیے قارئین کو اشارات سے واقف کراتا ہوں۔ اس طرف توجہ دلاتا ہوں کہ دس صدیوں تک کے اختتام کی حالت کو دیکھ کر آپ خود اندازہ فرمالیں کہ اس وقت جو "مجدد" ہوگا اسی کی روحانیت کس قدر بلند پایہ اور اس کا طرزِ تعلیم کس قدر مؤثر اور ہمہ گیر ہوگا جو ان فتن میں امت کے ایمانوں کی نگہبانی کرے، اور ان ظاہری و باطنی آفات کے تھپیڑوں میں کشتیٔ اسلام کو کھینچ کر کنارے لگائے، وہی الف ثانی "کے" مجدد" حضرت امام ربانی ہیں، جن کے علوم و معارف نے دنیائے کفر و ضلال میں تہلکہ مچا دیا، تعلیماتِ شیخ کے سارے گوشے نہ سہی، حضرت "مکتوباتِ امام" کو یک نظر ملاحظہ فرمایئے۔ اللہ اللہ علوم ظاہری و باطنی کا ایک اتھاہ سمندر ہے جس کی گہرائیوں کا علم نہیں، جن میں حقائق شرعیہ و اسرارِ فقہیہ کا عدیم المثال ذخیرہ موجود ہے، خوارق و کرامات کا سمندر اُمنڈ رہا ہے، پھر چونکہ اس دور کا سب سے گہرا مرض ابتداع و بدعت پسندی تھا جو پوری عمارتِ دین کو منہدم کرنا چاہتا تھا اس لیے "نباضِ سرہند اور حکیم اسلام" نے جتنی اس پر توجہ دی، شاید کسی دوسرے مسئلہ پر دی ہو، الغرض حضرت امام کے بے انتہا مناقب میں سے صرف یہ دو جملے کافی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مجدد ہیں دوسرے یہ کہ وہ الف ثانی کے مجدد ہیں جو بنصِ حدیثِ نبوی ظہور فتن کے لحاظ سے خطرناک صدی تھی اور جس کا تقاضہ تھا کہ ایسے خطرناک دور میں کوئی معمولی نہیں بلکہ رئیس المجددین بھیجا جائے جو ان عظیم مہالک و فتن کی مدافعت کر سکے۔

آئندہ سطور میں آپ "حضرت امام" کی زبردست مجددانہ سرگرمیوں کا جائزہ لیں اور انصاف سے کہیں کہ جس دور کے متعلق بنصِ حدیث شرور و آفات کے "برسات" کی خبر دی گئی ہے۔ اس صدی کے مجدد نے کیسی عزیمت و ہمت سے کام لے کر علمی برکتوں اور عملی ہمتوں کی لگاتار جھڑی لگا کر کس طرح گندگی اور کیچڑ کو دھو کر جسدِ امت کو صاف کیا اور عرب و عجم میں کس طرح اپنی برکات کی تازگی پھیلادی

ع خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

حیرت ہے کہ اِس صدی کے "خود ساختہ مجدّدین" جو ایسے اولوالعزم ارباب ہمت صدق پر کیچڑ اُچھالتے ہیں، وہ بڑی ڈھٹائی سے کہتے ہیں کہ امام ربانی نے امت کے "روگ" کو پوری طرح سمجھا نہ علاج کیا بلکہ جس غذا سے پرہیز کرانے کی ضرورت تھی وہی پھر کھلادی۔ آہ یہ ستم ظریفی اور احسان فراموشی!

حدیث تجدیدِ اُمّت پر ایک نظر

اب جبکہ حضرت مجدّد صاحب کی پوری زندگی کا حقیقی جوہر اور منقبتِ اصلی سامنے آگئی۔ ضرورت ہے کہ مختصراً "حدیث بعثت مجدد دین" پر فنی اعتبار سے ایک نظر ڈال لی جائے۔

حدیث بالا ابوداؤد اور طبرانی میں ہے، محدّث نبیل ملّا علی القاری الحنفی رح شرح مشکواۃ میں فرماتے ہیں کہ

اِس حدیث کو ابوداؤد اور طبرانی نے اوسط میں روایت کیا ہے اس کی سند صحیح ہے اور اِس کے جملہ راوی ثقہ ہیں، ایسے ہی امام حاکم رح نے اس کی تصحیح کی ہے۔"

(مرقات ص۲۴۸ ج۱)

نیز کنز العمال سے پتہ چلتا ہے (ج ۶ ص۲۲۸) کہ اس حدیث کو امام بیہقی رح نے بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اِس کے علاوہ ابونعیم رح نے "حلیۃ الاولیاء" میں امام بزاز رح اور حسن رح نے اپنے اپنے مسانید میں اور ابن عدی رح نے "کامل" میں روایت کیا ہے (مجموعۃ الفتاوی ص۱۵۱ ج۲) دیگر ائمہ حدیث نے بھی تصیحح کی ہے۔ (مرقات الصعود للسیوطی رح)

نیز اِس موقعہ پر یہ بات ذہن میں رہے کہ ایک صدی میں ایک ہی مجدّد پر انحصار غلط ہے بلکہ ایک صدی میں کئی مجدّد ہو سکتے ہیں اور مختلف علوم وفنون کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ ہونا بھی کوئی بعید نہیں، اِس مسئلہ کی زیادہ تفصیل امام الہند فیلسوف اسلام حضرت حکیم الامت الشاہ ولی اللہ الدہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتابوں میں ملے گی۔ نیز مولانا عبدالحیّ لکھنوی رح نے "مجموعۃ الفتاویٰ" (ص۱۵۲ ج۲) میں "مرقات الصعود"، اور ملّا علی القاری رح نے "مرقات" میں وضاحت کے ساتھ اس مسئلہ کو بیان کیا ہے، بخوفِ طوالت صرف ایک حوالہ پر اکتفا کرتا ہوں۔

مشہور محدث اور فقیہ دسویں صدی ہجری کے ایک مجدد ملا علی قاری حنفی فرماتے ہیں کہ:

"میرے نزدیک تجدید کرنے والے سے صرف ایک شخص مراد نہیں، بلکہ ایک جماعت مراد ہے جو تجدید کرے گی اور یہ جماعت مختلف بلاد اور مختلف فنون و علوم شرعیہ میں ہوگی، جو جس کے لیے زیادہ آسان ہے۔ اس میں مفتی، مناظر، مدرس، مؤلف، مصنف وغیرہ سب شامل ہیں بشرطیکہ اتفاق ہو مدد کی، حمایت دین، احیاءِ سنت، اخماد بدعت اور احقاق حق کی شرائط پوری ہوں" (مرقات ص۲۴۸ ج ۱۲)

ہم نے مختصراً اس مسئلہ کی وضاحت کردی، تفصیلات کے طالب کتب متداولہ کی طرف رجوع فرمائیں۔

ان ابتدائی مقدمات کے بعد ہم "رئیس المجددین"، "حامی السنۃ"، "قامع البدعۃ"، "قطب وقت"، "جامع الشریعۃ والطریقۃ"، "وارث کمالات نبوت" ابوالبرکات بدرالدین سیدنا حضرت الشیخ احمد الفاروقی سرہندی معروف بہ امام ربانی مجدد الف ثانی نوراللہ تعالیٰ مرقدہ وقدس اللہ تعالیٰ سرہ العزیز و برد اللہ تعالیٰ مضجعہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس بطلِ حریت حامل لوائے شریعت کی مبارک و مسعود زندگی کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ ع

زباں پہ بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا (جاری ہے)

ڈاکٹر اسرار احمد
کی
حد درجہ جامع تصنیف
نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت
کا مطالعہ کیجیے
سفید کاغذ ○ عمدہ طباعت ○ قیمت ...
مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن ○ لاہور

علامہ فضل حق خیرآبادی (آخری قسط)

حکیم محمود احمد برکاتی

جہادِ حریت

علامہ ایک مدرس تھے، مصنف تھے، منصف تھے اور حاکم تھے، متکلم تھے، منطقی تھے، عربی زبان کے ادیب و شاعر تھے، ان کے ساتھ ہی وہ ایک مدبر سیاسی اور مجاہد حریت بھی تھے اور اس میدان میں بھی وہ نمایاں ہی رہے۔ اپنے بہت سے ہم قدم اور ہم سفر رفقاء سے ممتاز ہی رہے اور پھر اس کا صلہ بھی پایا۔ حکام فرنگ نے انہیں گرفتار کر لیا اور چوں کہ وہ "خطرناک ترین آدمی" تھے "جو کسی وقت بھی (فرنگی حکومت کو) بے حد نقصان پہنچا سکتا ہے اس لیے ایسے شخص کو سخت ترین سزا دینا چاہیئے اور اسے خاص طور سے ہندوستان سے خارج کر دینا چاہیئے۔"

(فیصلہ)

فرنگی حاکم کا یہ فیصلہ علامہ کی عظمت و مقام کا واضح اعتراف اور ثبوت ہے۔

علامہ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز اپنے والد ماجد کے حکم سے اور اپنی مرضی کے علی الرغم کمپنی کی ملازمت سے کیا اور ان کے مکاتیب سے ظاہر ہے کہ وہ بادلِ ناخواستہ یہ ملازمت کرتے رہے اور چاہتے رہے کہ والد ترکِ ملازمت کی اجازت دے دیں لیکن اجازت نہیں ملی۔ مگر والد کی وفات (۱۸۲۹ء) کے بعد ۱۸۳۱ء میں کمپنی کی ملازمت سے مستعفی ہو گئے اور ملک کی متعدد ریاستوں میں اعلیٰ مناصب پر حسنِ انتظام کے جوہر دکھاتے رہے مگر ملک پر بتدریج بڑھتے ہوئے غیر ملکی تسلط اور ملک کے باشندوں کی بے روزگاری، معاشی خستہ حالی اور طرح طرح کی شہری مشکلات کو دیکھ کر کڑھتے اور سوچتے رہتے تھے اور ان کے ازالے کے لیے کوشاں

بھی رہتے تھے، جس کا اندازہ علامہ کی تحریر کردہ اس درخواست سے ہوتا ہے، جو انہوں نے ساکنانِ دہلی کی طرف سے اکبر شاہ ثانی کے نام ۱۸۲۷ء سے پہلے کسی سن میں لکھی تھی اور تفصیل کے ساتھ تجارت، زراعت، حرفت، زمین داری اور سرکاری دفتر میں اہلِ دہلی کی مشکلات اور ان کے اسباب کا جائزہ لیا ہے، خاص بات یہ ہے کہ دہلی پر ۱۸۰۳ء سے انگریزوں کا تسلط ہو چکا تھا اور لال قلعے کے مغل بادشاہ کمپنی کے وظیفہ خوار اور بے اقتدار تھے مگر درخواست کمپنی کے ریذیڈنٹ کے نام نہیں (جو با اختیار اور دراصل حاکم تھا) بلکہ اکبر شاہ ثانی کے نام ہے، اس میں کئی سیاسی اور نفسیاتی منافع و مصالح تھے،

علامہ کمپنی کے تسلط کے صرف اس لیے خلاف نہیں تھے کہ وہ برطانوی اور غیر ملکی کمپنی ہے بلکہ اس لیے خلاف تھے کہ وہ نصاریٰ ہیں اور اہلِ ہند کو بھی نصرانی بنا لینے کے عزائم رکھتے ہیں اور ان عزائم کے لیے مسلسل اقدامات کر رہے ہیں۔ جدید تعلیمی نظام رائج کر کے وہ اپنے مقاصد کی تکمیل چاہتے ہیں، ساتھ ہی وہ خلتہ اور پردہ کے رواج کو ختم کرنے کے درپے ہیں، علامہ کی طرح ملک کے مختلف گوشوں میں دوسرے اہلِ دل اور اربابِ نظر بھی یہ مناظر دیکھ رہے تھے اور فرنگی تسلط کے خلاف، جہاد کی تیاریاں جاری تھیں۔ ملاقاتیں ہو رہی تھیں۔ مشورے کیے جا رہے تھے۔ بالآخر منصوبہ تیار کر لیا گیا اور مئی کا مہینہ طے کر لیا گیا۔ چنانچہ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو جہاد کا آغاز ہو گیا۔ اور میرٹھ کی چھاؤنی سے انگریزی فوج کے مقامی سپاہیوں نے بغاوت کا اعلان کر دیا اور دہلی پہنچ گئے۔ باغی فوجیوں اور انگریزی فوج میں معرکہ گرم ہو گیا۔ میرٹھ کے علاوہ ملک کے دوسرے حصّوں سے بھی مجاہدین دہلی پہنچ گئے اور سب نے مل کر انگریزوں کو دہلی سے نکال باہر کیا اور ایک بار پھر لال قلعہ مرکزِ حکومت بن گیا، علامہ اگرچہ اُس زمانے میں ریاست الور سے ملازم معاش کا تعلق رکھتے جو دہلی سے صرف اسّی میل دُور ہے۔ مگر ہنگامے کے آغاز کے وقت غالباً دہلی ہی میں تھے (کیونکہ ہنگامہ ۱۰ مئی / ۱۶ رمضان کو شروع ہوا تھا اور علامہ کے اہل و عیال دہلی میں ہی رہتے تھے اس لیے رمضان عموماً اہل و عیال کے ساتھ گزارے جاتے تھے) یا پھر وہ معرکہ کی ابتدا ہی میں دہلی پہنچ گئے تھے جبکہ ڈاکٹر مہدی حسین کا قول ہے۔ دہلی علامہ کا

وطن ثانی تھا۔ گھر دہلی میں تھا۔ ان کا بیشتر حلقۂ احباب ان کے غالب ان کے آزردہ دہلی میں تھے۔ لال قلعے سے خصوصاً موجودہ تخت نشین بہادر شاہ ظفر سے ان کے دیرینہ مراسم تھے، غرض دہلی اور اہلِ دہلی ان کے لیے اجنبی نہیں تھے، جانے پہچانے تھے پھر بھی انہوں نے جائزہ لیا تو محسوس ہوا کہ:

بادشاہ سن رسیدہ، ضعیف الرائے، ناآزمودہ کار، نیک و بد کی تمیز سے عاری، ملکہ اور وزیر کے اشاروں پر قدم اٹھانے والا ہے۔

وزیر (حکیم احسن اللہ خاں) اصل اختیار اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ انگریزوں کا ہوا خواہ ہے۔

شاہی خاندان کے افراد، فسق و فجور میں مبتلا، عیش کوشی و اسراف کے عادی، اور خود رائے ہیں۔ انہی میں سے ایک کو بادشاہ نے افواج کا سپہ سالار بنا دیا ہے — حال آں کہ وہ بزدل، خائن، بے عقل اور ناعاقبت اندیش ہے۔

میرٹھ اور اطراف ملک سے آئی ہوئی فوج کے متعدد گروہ ہیں۔ بعض دستوں کا کوئی سربراہ ہی نہیں ہے۔ بعض لوگ قیام و طعام کی سہولتوں سے محروم اور اس کے نتیجے میں بددل اور کم زور ہو گئے ہیں، بعض لوگ پہلے مرحلے میں جو مالِ غنیمت ہاتھ آیا، اس کو غنیمت سمجھ کر بیٹھ گئے۔ صرف ایک حصّہ فوجِ نصاریٰ کے سامنے صف آرا اور سرگرمِ پیکار ہے۔

ہندو آبادی کا بیش تر حصّہ انگریزوں کا حامی ہے اور وہ اپنے سرمائے اور افرادی طاقت سے انگریزوں سے تعاون کر رہے ہیں۔

مسلمانانِ دہلی میں سے ایک گروہ جہاد میں حصّہ لے رہا ہے مگر ایک گروہ انگریزوں کا نمک خوار اور وفادار ہے وہ مجاہدین کو ذلیل و رسوا کرنے اور ان کے راستے میں مشکلات پیدا کرنے میں مصروف ہے۔

اس جائزے کے ساتھ علامہ بہادر شاہ ظفر سے ملے جو ان پر پہلے سے اعتماد کرتے تھے اور ان کی اصابتِ رائے اور اخلاص و دردمندی پر یقین رکھتے تھے۔ چنانچہ علامہ نے شاہ کو چند مشورے اپنے اس جائزے کے پیشِ نظر دیئے۔

(۱) مجاہدین کی اعانت، رقم اور سامانِ رسد سے

(۲) کارواں اور اہل حکام کا تقرر
(۳) مال گذاری کی تحصیل کا انتظام
(۴) ہمسایہ والیانِ ریاست کو جنگ میں اعانت و شرکت کی دعوت۔

چنانچہ شاہ نے حکم دیا کہ علامہ کی تمام ہدایات پر عمل کیا جائے اور ایسا ہی ہوا شاہ کے حکم سے، حکام براہِ راست علامہ سے ہدایات حاصل کرتے اور ان پر عمل کرتے۔ علامہ نے اوّلین اہمیت شہر میں قیام امن کو دی اور دہلی کا گورنر علامہ نے اپنے ایک عزیز میر نواب کو مقرر کیا، پھر خصوصی اہمیت ان کی نظر میں مجاہدین کی اعانت کے لیے رقم کی فراہمی کی تھی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اوّلاً مال گذاری کی تحصیل کے نظام کو باقاعدہ بنایا اور چند نئے تقرر کیے اور بقول حکیم احسن اللہ خاں" مولوی فضل حق نے بھی کئی تحصیل داروں کو ضلعے دار کی نیابت میں مقرر کیا۔ ثانیاً اطراف دہلی کے والیانِ ریاست کو خطوط لکھوائے کہ وہ جنگ آزادی میں شرکت کریں اور مالی اعانت کریں۔

علامہ نے صرف حال ہی کی اصلاح پر توجہ مرکوز نہیں رکھی، مستقبل کی طرف بھی توجہ دی اور اس معرکے کے شباب میں آپ نے جہادِ حریت کے کامیاب ہوجانے اور ملک کے غیر ملکی تسلط سے آزاد ہوجانے کے بعد، آزاد ہندوستان کے نظامِ حکومت کو اپنے غور و فکر کا موضوع بنایا اور اس کے نتیجے میں ایک "دستور العمل سلطنت" ترتیب دیا جس میں شخصی حکومت اور نااہل مغل فرمانروا کو شاہنشاہ کے بجائے ایک دستوری حکومت اور آئینی بادشاہت کا سربراہ بنانے کی تجویز رکھی جس میں شاہ کے اختیارات کم سے کم ہوں اور شہریوں کو بھی حکومت میں شرکت کا موقع ملے، اس دستور کو مؤرخ نے بجاطور پر ایک "جمہوریت اساس دستور" — "A CONSTITUTION BASED ON — PRINCIPLES OF DEMOCRACY" لکھا ہے۔ مولوی ذکاء اللہ کا بیان ہے کہ یہ دستور جزوی طور پر نافذ بھی ہوگیا تھا۔ اس دستور کی بنیاد پر ایک مجلس منتظمہ تشکیل دی گئی تھی جو دس ارکان پر مشتمل تھی۔ ان میں سے چھ فوج کے نمائندے تھے اور چار شہری۔ ان شہری ارکان میں سے ایک علامہ بھی تھے۔ اس مجلس کا نام "ایڈمنسٹریشن کورٹ یعنی جلسہ انتظام ملکی و فوجی" رکھا گیا تھا اور جسے مختصراً صرف کورٹ بھی کہا اور لکھا جاتا تھا۔ اس کے باقاعدہ قواعد و ضوابط مرتب کیے گئے تھے اور حسنِ

اتفاق سے محفوظ بھی ہیں۔ یہ قواعد اردو میں ہیں اور اس موضوع پر غالباً پہلی اردو تحریر ہے۔ اس میں مجلس کے بجائے جلسہ، ووٹ کے بجائے رائے اور سیکرٹری کے بجائے سکرٹری کی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں،

اسی دوران ایک اور اہم کمیٹی تشکیل دی گئی تھی جسے کنگ کونسل کہا گیا ہے۔ اس کے صرف تین رکن تھے، ان میں سے ایک علامہ تھے۔ دوسرے مجاہدین کے سربراہ مولوی سرفراز علی، تیسرے مجاہدین کی فوج کے سپہ سالار جنرل بخت خاں، کنگ کونسل کے بجائے اسے پریوی کونسل بھی کہا گیا ہے۔

علامہ ادھر ان اہم مجالس کے رکنِ رکین تھے ادھر عملی سرگرمیوں میں بھی منہمک تھے۔ عوام کو اپنے مواعظ اور فتووں کے ذریعے اور خواص اور فوجیوں کو اپنی گفتگوؤں سے مسلسل بیدار، سرگرم عمل اور معرکہ آرا ہونے کی ترغیب دے رہے تھے چنانچہ اس دور کا ایک اخبار نویس (مخبر) انگریز حکام کے نام اپنے ایک مراسلے میں لکھتا ہے:

"مولوی فضل حق اپنے مواعظ سے مسلسل عوام کو بھڑکا رہے ہیں۔"

ایک اور مخبر نے لکھا کہ:

"علامہ فوجیوں اور شہریوں کو برطانیہ کے خلاف بھڑکانے میں مسلسل مصروف ہیں۔"

ایک اور مخبر نے رپورٹ دی:

"مولوی فضل حق کی اشتعال انگیزیوں سے متاثر ہوکر شہزادے بھی میدان میں نکل آئے ہیں اور سبزی منڈی کے پل والے محاذ پر صف آرا ہیں"

یہی نہیں کہ دوسروں کو جہاد کی ترغیب دی بلکہ خود بھی جہاد میں عملاً حصہ لیا۔ اور شاہی فوج کی کمان کی۔ ڈاکٹر مہدی حسن لکھتے ہیں:

"اگر جیون لال (انگریزوں کے جاسوس) کے بیان پر اعتماد کیا جاسکتا ہے تو مولوی فضل حق نے شاہی فوج کی کمان بھی کی ہے۔"

افسوس ہے کہ اہلِ وطن کا یہ جہادِ حریت ناکام رہا۔ ابتدا میں نمایاں کامیابی رہی۔ اور دہلی پر مجاہدین کا اقتدار ہوگیا تھا اور انگریز فوج اور حکام دہلی بدر کر دیئے گئے

تھے مگر مقصد و اسباب کی بنا پر یہ فتح عارضی ثابت ہوئی۔ اور انگریزی فوجیں پھر دہلی کی طرف بڑھیں اور بالآخر ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو اس پر انگریزوں کا مکمل تسلط ہو گیا اور مجاہدین اور ان کے قائدین کے لیے اب دہلی کی زمین تنگ ہو گئی اور جو قائدین جہاد اور خواص انگریز حکام کے ہاتھ آ گئے ان کو پھانسی دے دی گئی اور جو حضرات کسی نہ کسی طرح بچ کر نکل جانے میں کامیاب ہوئے انہوں نے دہلی سے نکل کر اودھ کا رُخ کیا، جہاں ابھی تک معرکہ گرم تھا۔ اس طرح یہ حضرات ایک محاذ سے دوسرے محاذ پر منتقل ہو گئے اور جہاد جاری رہا۔

اودھ میں واجد علی شاہ کی حکومت کو ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے ختم کر کے اودھ کا الحاق کمپنی سے کر لیا تھا اور واجد علی شاہ مٹیا برج میں نظر بند تھے۔ اب دہلی میں یہ معرکہ برپا ہوا تو اودھ کے وطن دوست اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اور واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل کی قیادت میں منظم ہو کر سرگرم جہاد تھے۔

شاہ زادے مرزا برجیس قدر کو تخت نشین کیا تھا اور دہلی کو پھر مرکز سلطنت تسلیم کر کے اس سے اپنا رشتۂ اقتدار استوار کیا تھا۔ علامہ نے اودھ پہنچ کر حضرت محل سے تعاون کا فیصلہ کیا اور مجاہدین اودھ کو اپنی مدبرانہ و قائدانہ صلاحیتوں سے مستفید فرمانے لگے۔ بیگم حضرت محل کی فوج کے لیے ایک مجلس شوریٰ ترتیب دی گئی تھی جس کو پارلیمنٹ اور ارباب شوریٰ کہا جاتا تھا۔ علامہ اس کے بھی ایک ممتاز اور خصوصی رکن تھے۔ یہ فوج چین ہٹ، لکھنؤ، سیتا پور، بوندی میں ایک لاکھ سپاہیوں پر مشتمل انگریزی فوج سے معرکہ آرا رہی۔ آخری معرکہ بوندی میں ہوا۔

اس محاذ پر بھی فتح و نصرت ہمارے لیے مقدر نہیں تھی۔ اہل وطن کی ناکامی مقدر ہو چکی تھی۔ وہ تمام حالات و عوامل مفقود تھے جو کامیابی کے لیے ناگزیر ہیں اور وہ تمام اسباب موجود تھے جن کی موجودگی میں کامیابی کا امکان ہی باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ یہ محاذ بھی اُجڑ گیا۔ فوج بکھر گئی۔ کچھ قائدین نے نیپال میں پناہ لی۔ کسی نے حجاز کی طرف ہجرت کی، کوئی سرحد کی طرف نکل گیا۔ علامہ خیر آباد چلے آئے اور جب ملکہ وکٹوریہ نے نومبر ۱۸۵۸ء میں اعلان معافی شائع کیا تو علامہ نے اس کاغذ کے دعدے پر اعتماد کر کے خود کو حکام فرنگ کے سامنے پیش کر دیا جنہوں نے

۳۰ جنوری ۱۸۵۹ء کو انہیں گرفتار کر لیا اور لکھنؤ لائے، ۲۲ فروری کو مقدمہ پیش ہوا۔ ۲۸ فروری کو فردِ جرم عائد کر دی گئی کہ:

"وہ ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء کے دوران بغاوت کا سرغنہ رہا اور دہلی اور اودھ اور دوسرے مقامات پر اس نے لوگوں کو بغاوت اور (فرنگیوں کے) قتل کی ترغیب دی۔"

"اس نے بوندی کے مقام پر مئی ۱۸۵۸ء میں باغی سرغنے موخاں (وزیر حضرت محل) کی مجلس مشاورت میں نمایاں حصہ لیا۔"

۴ مارچ ۱۸۵۹ء کو حبس دوام بعبور دریائے شور اور تمام جائداد و دیوان خانہ، محل سرا، کئی دیہات اور کتب خانہ کے ضبط کیے جانے کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ مئی ۱۸۵۹ء میں کلکتے لے جائے گئے اور وہاں سے ۸ راکتوبر کو انڈمان لے جائے گئے جہاں ایک سال اور گیارہ مہینے تک محبوس اور طرح طرح کی تکالیف اور شدائد میں مبتلا رہ کر اس امام معقول نے ۲۰ راگست ۱۸۶۱ء میں وصال فرمایا۔

مزار مبارک جزیرہ روس (ROSS) کے قریب ایک بستی نمک بھٹہ (ساؤتھ پائنٹ) میں ہے۔ علامہ کے برابر مولوی لیاقت علی الہ آبادی کا مزار ہے۔

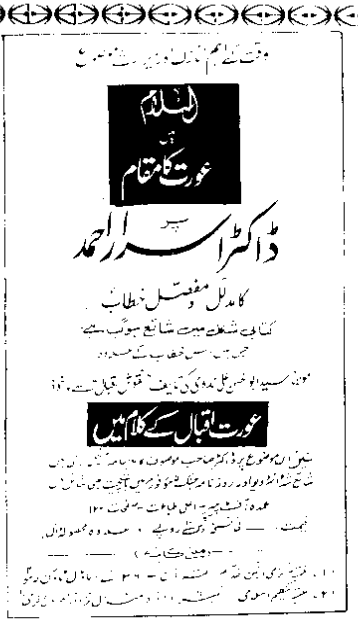

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ

اپنی تالیف **وحدتِ اُمّت** میں اگر

○ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رح اور مولانا سید انور شاہ کاشمیری

کے دو ایمان افروز اور سبق آموز واقعات کے سوا اور کچھ نہ لکھتے

تب بھی یہ کتاب موتیوں میں تُلنے کی مستحق ہوتی

وقت کے اہم ترین موضوع پر اس بہترین اور مفید ترین کتاب کو

اب مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نے شایانِ شان طور پر شائع کیا ہے

بڑے سائز کے ۵۲ صفحات ○ عمدہ دبیز کاغذ ○ دیدہ زیب کور

ہدیہ : ۴ روپے ○ علاوہ محصول ڈاک

ڈاکٹر اسرار احمد

نے اپنی دوسری دینی اور علمی خدمات کے ساتھ ساتھ شادی بیاہ کی تقریبات کے ضمن میں

ایک اصلاحی تحریک

بھی برپا کی اور خطبۂ نکاح کو محض ایک رسم

کی بجائے واقعی تذکیر و نصیحت اور معاشرتی زندگی سے متعلق اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کا ذریعہ بنایا

اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی ایک اہم تحریر اور ایک خطبۂ نکاح دونوں ایک کتابچے کی صورت میں شائع ہو گئے ہیں

بڑے سائز کے ۴۸ صفحات ○ عمدہ دبیز کاغذ ○ دیدہ زیب کور

ہدیہ : ۴ روپے ——— محصول ڈاک علاوہ

ان دونوں کی زیادہ سے زیادہ اشاعت اہم قومی ملی اور دینی فریضہ ہے

حضرت عبداللہ بن مُبارکؒ

تفقہ فی الحدیث و آثار الصحابہ

نصرت علی اشہیں

آپ نے حدیث رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق اس شدت سے دکھاکہ آپ حدیث کے ناطے سے ہی پہچانے جانے لگے۔ یہ تعلق دو وجہ سے تھا۔ ایک یہ کہ قرآن کی معرفت حدیث سے حاصل ہوسکتی تھی۔ دوم یہ کہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ لوگوں کی آراء میں سے وہی کچھ قبول کیا جاسکتا ہے جو حدیث کی تشریح کرے۔ اس طرح حدیث ہی تمام علم وحکمت کا خزانہ تھی۔ جس کی وجہ سے آپ کو والہانہ عقیدت ہوگئی ابُو اسامہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میرا گزر ہوا تو حضرت عبداللہ بن مبارک طرسوس میں درس حدیث دے رہے تھے۔ میں نے کہا۔ اے ابوعبدالرحمٰن! حدیث کو ابواب اور تصانیف کے رنگ میں پڑھانے کو اسلاف نے کسی طور سے پسند نہیں کیا۔ جسے آپ نے اختیار کر رکھا ہے۔ ہم نے اپنے اساتذہ کو بھی ایسے کرتے نہیں دیکھا۔ آپ نے فرمایا کہ میں بس اب حدیث نہیں پڑھاؤں گا۔ تھوڑے دنوں کے بعد جب پھر گزرا تو آپ پھر لوگوں کے حلقہ میں بیٹھے درس حدیث دے رہے تھے۔ میں نے سلام کیا، تو کہنے لگے۔ ابُو اسامہ (معذرت کے ساتھ) حدیث کی لذّت مجھے باز نہیں رہنے دیتی۔) [۱]

اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ آپ صرف حدیث کی روایت ہی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اسے مختلف موضوعات کے ابواب کی صورت میں جمع کرکے اس کی تشریح وتوضیح کے ساتھ تصنیف کراتے۔ جس کی وجہ سے لوگوں کا ہجوم گھیرے رکھتا۔

۱۔ ابونعیم اصبہانی: حلیۃ الاولیاء: ۸: ۱۶۵ [۲]۔ حافظ ابن الحاکم: کتاب معرفۃ علوم الحدیث: ۶۷

ایک آپ کا اپنا شوق اور دوسرا لوگوں کا اصرار اور دباؤ آپ کو حدیث کے درس پہ مجبور کر دیتا - آپ کی فکرِ عمیق سے بھری اور نکتہ رس فصیح و بلیغ خطابت نے آپ کو منارۂ علم بنا دیا تھا - حدیث کے معانی و مطالب بڑی وضاحت سے بیان کرتے اور ضروری مسائل پہ پُرتشفی جواب دیتے -

آپ کے ایک ساتھی حبان فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے کہا کہ حضرت عائشہ کا وہ قول جو انہوں نے آسمان سے برأت نازل ہونے کے بعد حضورؐ سے کہا کہ تعریف اللہ کے لئے ہے آپ کی نہیں - یہ میری سمجھ میں نہیں آیا - آپ نے فرمایا کہ حضرت عائشہ نے حمد اسی کی کی ہے جو اس کا سزاوار ہے - [1]

ابن حاکم نے اسی کے ساتھ ایک اور قول نقل کیا ہے کہ آپ سے پوچھا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول "کلابس ثوبی زور" کا مطلب کیا ہے - تو آپ نے فرمایا کہ وہ شخص جو وہ کچھ پہنے جو اس کے لئے نہیں ہے [1]

حسن بن ربیع فرماتے ہیں کہ میں نے آپ سے پوچھا کہ حدیث "طلبُ العلم فریضة علی کل مسلم ومسلمة" کا دائرہ کیا ہے - آپ نے فرمایا اس سے مراد وہ نہیں جو اس کو حاصل کرتے ہیں - لیکن یہ فرضیت اس وقت ہے جب کسی پہ کوئی دین کا مسئلہ آ پڑے یا اس سے پوچھا جانے والا ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کا ضروری علم حاصل کرے [2]

ابن عمر روایت کرتے ہیں - کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "یدنی المومن ربّه یوم القیامة حتی یضع علیه کنفه" آپ یعنی حضرت عبداللہ بن مبارک سے اس کا مطلب پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ کنف سے مراد خدا کی رحمت کا سایہ ہے جو ڈھانپ لے گا - [3]

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو حدیث پر پوری دسترس حاصل تھی - جہاں آپ حفظ حدیث میں ثقہ تھے وہاں علم حدیث کے جملہ معارف کے سلسلہ میں

---

[1] ابن الحاکم : کتاب معرفۃ الحدیث : ۶۷
[2] " " : جامع بیان العلم والفضلہ : ۱ : ۱۰
[3] " " : لسان العرب : مادہ کنف

لوگوں کی توجہ کا مرکز تھے ۔ اور آپ یہ سمجھتے تھے کہ جملہ معارف اسی ذخیرۂ حدیث یا آثارِ صحابہ میں مدفون ہیں ۔ چنانچہ آپ جب دن بھر گھر بیٹھ کر کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے سوائے اوقاتِ نماز کے کسی کو کہیں نظر نہ آتے تو لوگوں نے اس پوشیدگی پر استفسار کیا ۔ تو آپ نے فرمایا کہ میں جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی مجالس سے مستفید ہوتا ہوں یعنی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے آثار پر مبنی کتب کا مطالعہ کرتا ہوں اور ان سے مسائل کا ادراک اور فہم حاصل کرتا ہوں ۔ اسی طرح جب آپ سے پوچھا گیا کہ ہم استفادہ کہاں سے کریں تو آپ نے فرمایا ہماری کتابوں سے یعنی احادیث و آثار کے ساتھ ساتھ ہمارے ماخوذ اور مستنبط نتائج سے جو ہم نے اپنی کتابوں میں دے دیتے ہیں ۔ اور یہ آپ کی فقاہت حدیث کی دلیل ہے ۔ [1]

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ بحیثیت مؤرخ:

حضرت عبداللہ بن مبارک نے علم کی جستجو اور تجارت کے سلسلہ میں طویل سفر کئے ۔ کئی علماء، فضلا، صوفیاء، ادباء، شعراء اور امراء کے ساتھ ساتھ عوام کے ہر طبقہ کے احباب سے ملے ۔ کئی تاریخی شہادتوں کا عینی مشاہدہ کیا ۔ اور کئی ایسے نامور اور سربرآوردہ لوگوں سے ملے جو تاریخ کے کسی باب میں اہم حیثیت کے حامل تھے ۔ آپ ایک صادق، حق گو اور حق شناس فرد تھے ۔ جس نے واقعات کا تنقیدی، تحقیقی اور تجزیاتی سطح پر مطالعہ کیا ۔ اور اس کے بعد ان یادداشتوں پر مشتمل تاریخ لکھی ۔ جس کا تذکرہ اکثر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے ۔ امام ابن ناصر الدین فرماتے ہیں :- [2]

"الحافظ شیخ الاسلام واحد الائمہ الانام ذو التصانیف
النافعہ والرحلۃ الواسعہ"

یعنی آپ حافظ شیخ الاسلام اور لوگوں کے ائمہ میں سے ایک نامور امام ہیں جن کی گراں قدر تصانیف ہیں اور جنہوں نے طویل مسافتیں کیں ۔

---

[1] ابونعیم اصبہانی : حلیۃ الاولیاء : ۸ : ۱۶۵
[2] ابن العماد : شذرات الذہب : ۱ : ۲۹۶

عباس بن مصعب فرماتے ہیں :۔ [1]

"جمع ابن المبارك الحديث والفقه والعربية وايام الناس والشجاعة والسخا"

حضرت ابن المبارک نے حدیث، فقہ، عربی اور لوگوں کے ایام یعنی تاریخی احوال، شجاعت اور سخاوت کی جملہ خوبیاں باہم جمع کر رکھی تھیں۔

خیر الدین زرکلی لکھتے ہیں :۔ [2]

"عبد الله بن مبارك بن واضح الحنظلي بالولا والتميمي المروزي ابوعبد الرحمن الحافظ شيخ الاسلام المجاهد والتاجر صاحب التصانيف والرحلات - أفنى عمره في الاسفار حاجًا ومجاهدًا وتاجرًا وجمع الحديث والفقه والعربية وايام الناس والشجاعة والسخا"

عبداللہ بن مبارک ... ایک مجاہد، تاجر اور ایسے مصنف تھے جنہوں نے کئی سفر کئے۔ سفروں میں ہی آپ کی عمر گزری جو آپ کسی ضرورت، جہاد اور تجارت کے لئے کرتے۔ آپ نے حدیث، فقہ، عربی، تاریخ، شجاعت اور سخاوت کو باہم جمع کر دیا تھا۔

امام نسائی سے منقول ہے۔ [3]

"ما نعلم في عصر ابن المبارك اجل منه ولا اعلى ولا اجمع لكل خصله محمودة منه وقال جماعة من العلم اجتمع في ابن المبارك العلم والفقياء الحديث والمعرفة بالرجال والشعر والادب والسخاء العباده والورع"

ہمیں حضرت عبداللہ بن مبارک کے دور میں ان سے زیادہ عظیم المرتبت اور عظیم الشان فرد نظر نہیں آتا جس میں ہر نیک خصلت موجود ہو۔ اور

---

[1] خطیب بغداد : تاریخ : ۱۰ : ۱۵۵

[2] ابن حجر عسقلانی : تہذیب التہذیب : ۵ : ۳۸۷

[3] عبدالعزیز البدری : الاسلام بین العلماء والحکام : ۲۲۹ مطبوعہ مدینہ منورہ

اہل علم کی ایک اچھی خاصی تعداد کا کہنا ہے کہ آپ کے اندر علم، تقویٰ، حدیث، تاریخ (معرفت بالرجال) شعر، ادب، سخاوت، عبادت اور پرہیز گاری باہم جمع ہو گئی تھیں۔

ابن خلکان کا قول ہے۔

"ھو الحافظ شیخ الاسلام المجاھد، التاجر، صاحب التصانیف والرحلات جمع الحدیث والفقہ والعربیہ وایام العرب و الشجاعۃ والسخا"

آپ حافظ اور مذہب اسلام کے ایک بڑے بزرگ، مجاہد، تاجر اور مصنف تھے جنہوں نے طویل سفر کئے۔ اور حدیث، فقہ، عربی ادب، تاریخ عرب، شجاعت اور سخاوت کو اپنے اندر جمع کر دیا تھا۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔[1]

طلب العلم وروی روایۃ کثیرۃ وصنف کتبا کثیرۃ فی ابواب العلم وکان ثقۃ ماموناحجۃ کثیر الحدیث۔

آپ نے علم حاصل کیا۔ اور کثرت سے روایت کیا۔ آپ نے علم کے مختلف ابواب میں کتابیں لکھیں۔ آپ ایک ثقہ، قابل اعتبار اور کثرت حدیث کے ساتھ ساتھ قابل استدلال تھے۔

روایات بالا سے آپ کے علمی اسفار اور کثرت روایت کے ساتھ ساتھ آپ کی معتبر اور معتمد حیثیت سامنے آجاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ ایک جید مورخ تھے جنہوں نے خود طویل مسافتوں کے بعد علم کو جمع کیا اور اسے صحیح دیانت داری کے ساتھ روایت کر دیا۔ آپ کی تاریخ کا تذکرہ، حافظ ابن ندیم، زرکلی اور اسماعیل بغدادی جیسے نامور اور مستند تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ یہ کتاب مفقود ہے اس لئے مندرجات پر کلام نہیں کیا جا سکتا۔ (جاری ہے)

---

[1] ابن حجر: تہذیب التہذیب: ۵: ۳۸۲

بقیہ : درسِ قرآن

وہی ربط یہاں سورہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور سورہ فتح میں ہے غزوہ بدر کی تمہید ہے سورہ محمدؐ جو آج کل ہمارے زیر مطالعہ ہے اور یوم بدر کو اللہ تعالیٰ نے یوم فرقان قرار دیا اور سورہ فتح تمہید ہے فتح مکہ کی لہٰذا صلح حدیبیہ کو اللہ عزوجل نے فتح مبین قرار دیا ـــــ میں نے آج صرف چند تمہیدی باتیں عرض کی ہیں - آج انہی پر اکتفا کیجئے - اگلی نشست سے ہم باقاعدہ درس کا آغاز کریں گے - ان شاء اللہ العزیز

بارک اللہ لی ولکم فی القرآن العظیم ونفعنی وایاکم بالآیات والذکر الحکیم -

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

بقیہ : 'عبدیت کامل'

قرآن کریم میں الرسول مختلف صیغوں کے ساتھ حضورؐ کے لئے کئی سو مقام پر آیا ہے - اور شاہ صاحب نے پورے اہتمام سے ہر جگہ رسول کا ترجمہ رسول ہی کے لفظ سے کیا ہے -

دوسرے ارباب تراجم کے ہاں فارسی کا لفظ پیغمبر ملتا ہے لیکن شاہ صاحب پیغمبر کے لفظ کو الرسول کے مفہوم کی ادائیگی کے لئے ناکافی سمجھتے ہیں -

بعض اہل قلم حضرات الرسول کے ترجمہ میں قاصد اور ایلچی جیسے گھٹیا الفاظ استعمال کرتے ہیں جو رسول کے عربی لفظ کا لغوی مفہوم تو ہو سکتا ہے لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام نبوت و رسالت کی ترجمانی کی بجائے اس میں سوء ادب کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے -

---

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے اشاعت کی جاتی ہیں - انکا احترام آپ پر فرض ہے - لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں انکو صحیح اسلامی طریقے کیمطابق بیحرمتی سے محفوظ رکھیں -

بسلسلہ "رسول اللہؐ اور آپؐ کی تعلیمات کے بارے میں مستشرقین کا اندازِ فکر"

رومن امپائر کا زوال اور طلوعِ مغرب

(محترم عبدالقادر جیلانی کے مقالے کی دوسری قسط)

مغرب کی تعریف مغرب سے مراد یورپ کا وہ علاقہ ہے جو کیتھولک اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے معاشرے پر مشتمل ہے۔ دوسرے الفاظ میں "مغرب" پاپا کے رُوحانی اقتدار کا خطہ ہے۔" مغرب جن ممالک پر مشتمل ہے وہ تمام کے تمام مغربی بحرِ رُوم کے شمال میں واقع ہیں۔ اس میں پرتگال، اسپین، فرانس، اطالیہ، جرمنی اور ان سے ملحق چھوٹے چھوٹے ممالک نیز جزائرِ برطانیہ شریک ہیں۔

عیسائیت سے قبل رومن امپائر سیاسی اور انتظامی ضروریات کے پیشِ نظر مشرقی اور مغربی خطوں میں منقسم تھی۔ یہ خطّے علی الترتیب ایسٹرن امپائر اور ویسٹرن امپائر کہلاتے تھے۔ جب رومن امپائر میں مذہب عیسائیت رائج ہوا، تو ان ہی خطوں کے اعتبار سے منقسم ہوکر مشرقی عیسائیت (Eastern Christianity)

نوٹ :- مغرب کی تقسیم جغرافیائی اعتبار سے بھی کی جا سکتی ہے۔ بحرِ رُوم سسلی کے جنوب میں راس سوریلو (Cape Sorello) اور تیونس کی راس بون (Cape Bone) کے درمیان اندازاً اسو (۱۰۰) میل عریض آبی گذرگاہ بن جاتی ہے جس کے سبب اس کی تقسیم قدرتی طور پر مشرقی اور مغربی سمندروں میں ہو جاتی ہے۔ مشرقی بحرِ روم کے کنارے واقع ممالک مشرقی یورپ اور مغربی بحرِ روم کے ساحلی ممالک مغربی یورپ یا صرف مغرب کہلاتے ہیں۔

اور مغربی عیسائیت (Western Christianity) کہلایا۔

مغربی تہذیب ایّامِ قدیم سے بحرِ روم کے یہ دونوں خطے مشرقی اور مغربی تہذیب کے گہوارے رہے ہیں۔ مشرق میں اگر یونانی تہذیب پروان چڑھی تو مغرب میں تہذیب پھلی پھولی۔ مغربی تہذیب نے خود کو رومی تہذیب کے آثار پر استوار کیا۔ رومن تہذیب کے بطن میں رومن چرچ نے پرورش پائی اور رومنہ الکبریٰ کے زوال کے بعد یہی رومن چرچ رومی تہذیب کا وارث ہوا۔ چرچ نے مغرب میں ایک نئے معاشرے کو جنم دیا جو مغربی معاشرہ کہلایا۔

"رومن امپائر"

رُوم کے معمار رومی تہذیب کے اولین معمار ایشیائے کوچک کے باشندے اترسکن (Etruscans) تھے۔ انہوں نے شمالی اطالیہ پر قبضہ کیا۔ صنعتی اور تجارتی شہر بسائے۔ عظیم بحری قوت قائم کی۔ یونان اور کارتھیجیہ سے علاقے فتح کرکے اطالیہ میں شریک کئے۔ ڈھائی صدی حکمرانی کی اور ۴۷۴ء (قبل مسیح) میں پردۂ گمنامی میں چھپ گئے۔[1] اگرچہ کہ روم کی تہذیب ان ہی کی مرہونِ منّت ہے مگر مغرب اترسکن دور کو اپنی تاریخ میں جگہ دینے کو تیار نہیں۔[2]

رومن امپائر کا قیام اترسکن حکمرانوں کے بعد روم نے پانچویں صدی (قبلِ مسیح) میں رومن امپائر کا سنگِ بنیاد رکھا۔[3] تیسری صدی (قبلِ مسیح) تک رومن امپائر اس قدر مستحکم ہوچکی تھی کہ بیرونِ اطالیہ بسنے والی اقوام سے ٹکر لینے لگی۔ ۲۱۸ء (قبلِ مسیح) میں کارتھیجیہ کے ساتھ جنگیں شروع ہوئیں جو پیونک وار (Punic Wars) کہلاتی ہیں۔[4] ان جنگوں کا اختتام ۱۴۶ء (قبلِ مسیح) میں کارتھیجیہ کی مکمل تباہی پر ہوا۔ کارتھیجیہ

---

1. John Bowle A New Outline of World History
2. Ibid.
3. Encyclopaedia Britanica. Art Senate. P. 1087, Vol 15.
4. Jones, A H.M. The Decline of the Ancient World, P. 10.

ایک عظیم سامی تہذیب تھی - یہ تجارتی اور صنعتی تہذیب جس کا بحر روم پر تسلط تھا، جس کے عظیم الشان شہر تھے۔ رومی نفرت کے سیلاب کی نذر ہو گئے -

رومن امپائر کی توسیع

کارتھیجینہ کی تباہی کے بعد روم، بحر روم کی عظیم ترین قوت بن گیا - یونان کی قوت و اقتدار کو جیسے جیسے زوال آتا گیا، روم اس کی جگہ لیتا گیا - سسلی اور سارڈینیہ کا الحاق پیونک وار سے قبل (۲۴۲ء ق م) میں ہو چکا تھا - اسپین کو ۲۰۲ء (ق م) میں رومن امپائر کا صوبہ بنایا گیا - آفریقیہ ۱۴۶ء (ق م) میں سقوط اقرطاجنہ (کارتھیجیہ) کے بعد شریک سلطنت کیا گیا - مقدونیہ اور یونان بھی اسی سال روم کے زیر نگیں آئے۔

ایشائے کوچک اور جنوبی گال ۱۱۸ء (قبل مسیح) میں فتح ہوئے - اسی سال شام پر فوج کشی کر کے شریکِ سلطنت کیا گیا ۶۴تا۶۳ء (قبل مسیح)، آرمینیہ کی فتوحات ہوئیں - ۵۸تا۵۰ء (قبل مسیح)، جولیس سیزر نے شمالی گال (فرانس)، کو رومن امپائر کا جزو بنایا - آگسٹس نے مصر اور دریائے ڈینیوب کے علاقوں کو شریکِ سلطنت کیا اور آگسٹس کے عہد کے بعد اہم الحاق جزائر برطانیہ کا ہے جسے کلاڈیس نے ۴۳ء میں فتح کیا اور ۹۹ء میں بالائی عراق کو فتح کر کے رومی سلطنت میں شریک کیا گیا -

اس طرح پہلی صدی عیسوی کے اختتام تک رومن امپائر دُنیا کی عظیم ترین سلطنت بن چکی تھی جو بحرِ روم سے ملحق تمام علاقوں پر مشتمل تھی -

سلطنت کی مشرقی اور مغربی خطوں میں تقسیم

شہنشاہ آگسٹس کا دورِ حکومت رومۃ الکبریٰ کے انتہائی عروج کا دور تھا - آئینی اعتبار سے شہنشاہ روم کو عوام اور سینٹ نے چند قانونی اختیارات دیئے تھے[1] مگر عملاً رومی شہنشاہ مطلق العنان حکمران ہوتا - وہی رومن افواج کا سپہ سالار ہوتا - اسی کے نمائندے تمام صوبوں پر حکومت کرتے - قانونی معاملات میں وہی اقتدار اعلیٰ تھا - سلطنت کا اعلیٰ

---

[1] تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائیے -

1. Jones, A.H.M. -The Decline of the Ancient World

ترین جج بھی وہی تھا اور مملکت کے تمام مالی ادارے اور خزانے اسی کے اختیار میں تھے۔

رومی شہنشاہیت موروثی نہ تھی۔ شہنشاہ کا انتخاب رائے شماری کے ذریعے سینیٹ کرتی یہ انتخاب ہر شہنشاہ کے مرنے کے بعد ہوتا۔ آگسٹس کے جمہوری آئین مجریہ ۲۷ھ (قبل مسیح) (Republican Constitution) کی رو سے شہنشاہ کے انتخاب کا حق صرف سینیٹ کو تھا[1] لیکن پہلی صدی عیسوی میں فوج کا اثر اور اقتدار اس قدر بڑھ گیا کہ خود سینیٹ فوج کے زیر اثر ہو گئی۔ چنانچہ شہنشاہ کلاڈیس (Claudius, 14-54-A.D.) کی تخت نشینی کا اعلان فوج نے کیا اور سینیٹ نے اس اعلان کی توثیق کی۔ آہستہ آہستہ اس انتخاب نے وراثتی جانشینی کی شکل اختیار کر لی چنانچہ پہلی صدی عیسوی کے بیشتر شہنشاہ آگسٹس کے گھرانے کے لوگ تھے۔

مسئلہ جانشینی

شہنشاہ کی جانشینی ایک ایسا مسئلہ تھی جس کے باعث روم کو متعدد بار خانہ جنگیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے رومی شہنشاہوں نے اپنی حیات میں ہی اپنے جانشینوں کو اہم اختیارات تفویض کرنا شروع کر دیئے تاکہ آئندہ اقتدار سنبھالنے کی راہ ہموار ہو جائے لیکن یہ طریقہ کار بھی مفید ثابت نہیں ہوا۔ فوج اور سینیٹ اگر کسی شخصیت کے انتخاب پر متفق نہ ہوتیں تو مختلف سپہ سالار اپنی اپنی افواج سے اپنی شہنشاہیت کا اعلان کرا دیتے چنانچہ شہنشاہ وسپاسین (Vespasian) ۶۹ء میں ایسی ہی خانہ جنگی کے بعد فاتح کی حیثیت سے ابھرا۔

۹۶ء میں جب نروا[2] (Nerva) کو فوج اور سینیٹ نے شہنشاہ منتخب کیا تو اس نے یہ طریقہ کار بنایا کہ ہر شہنشاہ اپنے بیٹے کو اپنا جانشین بنائے۔ گویا یہ طریقہ کار تقریباً ایک صدی رائج رہا لیکن خانہ جنگی کا سلسلہ بدستور قائم رہا اور جانشینی کا

---

1. Encyclopaedia Britanica, Republic Restitute, P. 1107, Vol. 15.
2. Jones, A.H.M. The Decline of the Ancient World, P. 12.
3. Chambers Encyclopaedia, P. 746, Vol. IX and P. 774 Vol. XI.

اختیار دوبارہ فوج نے لے لیا۔

رومن امپائر کی تقسیم مغرب مشرق

۲۸۴ء میں فوج نے ڈیوکلیٹن (Diocletian) کو شہنشاہ منتخب کیا[1]۔ اس نے سلطنت کے استحکام کی خاطر رومن امپائر کو دو انتظامی خطوں میں تقسیم کر دیا۔ اس میں سے ایک مشرقی سلطنت روم (Eastern Roman Empire) اور دوسرا مغربی سلطنت روم (Western Roman Empire) کہلایا[2]۔ مشرقی سلطنتِ روم کا نظم و نسق اس نے خود سنبھالا اور مغربی سلطنت کی حکمرانی کے لئے میکسیمین (Maximian) کو اپنا ہم منصب منتخب کرایا[3]۔ نیز ہر دو حکمرانوں کے ایک ایک معاون جنہیں قیصر کہا جاتا تھا منتخب کرائے تاکہ یہ نہ صرف اپنے علاقے کے شہنشاہ کے مددگار ہوں بلکہ ان کے جانشین بھی ہوں۔ یوں عملاً سلطنتِ روم دو حصوں میں بٹ گئی اور اس پر دو شاہانِ کبیر اور دو شاہانِ صغیر بیک وقت حکمران ہو گئے۔

ڈیوکلیٹن نے ۳۰۵ء میں تخت سے دستبرداری اختیار کی تو ہر طرف آگسٹس (شاہ کبیر) اور قیصر (شاہ صغیر) اٹھ کھڑے ہوئے۔ ۳۰۶ء میں سات حکمرانوں کو آگسٹس ہونے کا دعویٰ تھا۔ ان میں سے شدید خانہ جنگی کے بعد قسطنطین اعظم (Constantine) شہنشاہ آگسٹس، اور لیسی نیس (Licinius) نائب یا قیصر کی حیثیت سے ۳۱۳ء میں تخت نشیں ہوئے[4]۔

پائے تخت کی منتقلی

۳۲۴ء میں قسطنطین نے آبنائے باسفورس کے شمالی ساحل پر ایک نئے شہر قسطنطنیہ کی بنیاد رکھی اور اسے اپنا پایۂ تخت بنایا[5]۔ رومن شہنشاہ کی روم سے قسطنطنیہ کی منتقلی اقتدار کی

---

1. Chambers Encyclopaedia, P. 777, Vol. XI.
2. Encyclopaedia Britanica, P. 1128, Vol. 15.
3. Jones, A.H.M. -Decline of the Ancient World, P. 29.
4. Ibid.
5. Gibbon Edward -The Decline and Fall of Roman Empire P. 140.

منتقل کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ آہستہ آہستہ سلطنت میں مشرقی اور یونانی اثرات بڑھنے اور رومی اثرات کم ہونے لگے۔ مغرب اس صورت حال کو برداشت کرنے کو تیار نہ تھا کیونکہ رومن فاتح اور حکمران قوم تھے اور یونانی محکوم۔ ملکی معاملات میں جب مغرب کا عمل دخل کم ہونے لگا تو مغرب نے اپنے معاملات میں عنانیت اختیار کی۔ مغربی شہنشاہ تقرر سنیٹ خود کرنے لگی۔

مغرب سے بے اعتنائی

چوتھی صدی عیسوی (۳۶۲ء) میں ہن قوم نے یورپ پر حملہ کیا اور دریائے ڈنیسٹر (Dniester) کے سواحل پر جرمن قوم "گوتھ" آباد تھی جو مشرقی اور مغربی ساحل کی مناسبت سے آسٹرو گوتھ اور ویزی گوتھ کہلاتی تھی۔ تاب مقاومت نہ پاکر آسٹرو گوتھ نے پسپا ہو کر مغربی ساحل کے علاقے میں پناہ لی۔ آسٹرو گوتھ کے دباؤ نے ویزی گوتھ کو اپنا علاقہ چھوڑنے اور دریائے ڈینیوب کو عبور کر کے مشرقی سلطنت روم کی حدود میں داخل ہونے پر مجبور کر دیا۔ ویزی گوتھ حکمران نے شہنشاہ روم سے مملکت روم میں داخلے کا حق طلب کیا۔ یہ سب کچھ اس سرعت اور افراتفری کے عالم میں ہوا کہ شہنشاہ کو مصلحت اسی میں نظر آئی کہ داخلے کی اجازت دے دے کیونکہ رومن افواج سلطنت کے دور دراز صوبوں میں پھیلی ہوئی تھیں اور دریائے ڈینیوب پر متعین فوج کے لئے ویزی گوتھ سے مدافعت ممکن نہ تھی۔ جلد ہی یہ جرمن قوم سلطنت روم کے لئے دردسر بن گئی۔ نہ یہ کسی شہر یا علاقے میں بسائے جا سکتے تھے نہ ان کو منتشر کیا جا سکتا تھا۔ نہ یہ شہنشاہ کے احکام کے پابند تھے نہ ہی رومی تہذیب و تمدن سے آشنا۔ مذہبًا پوری قوم بت پرست تھی اور فطرتًا جنگجو۔ شہنشاہ نے اس جرمن قوم کے حکمران کو "رومن جنرل" کا خطاب بخشا تاکہ وہ اپنی قوم کا بادشاہ بھی رہ سکے اور شہنشاہ کے تابع بھی۔ چھ سال نہ گزرے تھے کہ ۳۷۸ء میں اس بیرونی قوم نے اپنے لئے ایک پسندیدہ علاقے کا مطالبہ کرتے ہوئے بغاوت کر دی۔

اس زمانے میں آرکیڈیس (Arcadius) مشرقی سلطنت روم کا شہنشاہ تھا اور اس کا بھائی ہونوریس (Honorius) مغربی سلطنت کا قیصر تھا۔ ان دونوں کے درمیان "الیرا (Illyra) کا علاقہ متنازعہ تھا اور

اس پر مغربی سلطنت کے حکمراں کا قبضہ تھا۔ شہنشاہ نے اپنے علاقے کو محفوظ رکھنے کے لئے اس مصیبت کا رُخ مغربی سلطنت کی طرف پھیر دیا۔ گوتھ حکمراں کو اجازت دیدی کہ الیرا کے علاقے پر قبضہ کرلے۔

مغربی سلطنت رُوم کی تباہی

وزیگاتھ نے الیرا پر قبضہ کرنے کے بعد سرزمین اطالیہ کا رُخ کیا۔ مغرب نے اپنی تمام افواج کو مجتمع کرکے ویزی گاتھ کو پے در پے شکستیں دیں۔ ان جنگوں کے باعث مغربی سلطنت کی سرحدیں دفاعی افواج سے خالی ہوگئیں۔ اٹلا کی سرکردگی میں ہن قوم کی یلغار جاری تھی جس کے باعث نئے نئے جرمن قبائل پسپا ہوکر مغربی سلطنت روم میں داخل ہونے لگے۔ وینڈال قبائل نے گال (موجودہ جنوبی فرانس) کا پورا علاقہ پامال کرکے بحر روم تک قبضہ جمالیا۔ انہوں نے اسپین اور شمالی افریقہ کے علاقے بھی مغربی سلطنت سے چھین لئے۔ وینڈال قبائل کی کامیابی نے برگنڈی قبائل کو شہ دی۔ انہوں نے شمالی اسپین اور شمالی فرانس کو آماجگاہ بنایا۔ اس طرح مغربی سلطنتِ روم اپنے صوبہ جات سے محروم ہوکر اطالیہ کی سرزمین تک محدود ہوگئی۔ خود اطالیہ پر ایک جرمن لیڈر، راداگائیس (Radagaisus) نے ایک بھرپور حملہ کیا۔ گو اسے شکست ہوئی لیکن اس حملے کے سبب اطالوی قوتِ مدافعت بھی ختم ہوگئی۔

وزیگاتھ قبائل اپنی ابتدائی شکستوں کے باعث خاموش تماشائی تھے لیکن اطالوی قوت کے کمزور ہوتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور پورے اطالیہ پر قبضہ کرلیا۔ مغربی شہنشاہ ہونوریس کو محصور ہونا پڑا۔ ۴۱۰ء میں وزیگاتھ حکمراں فاتحانہ شان سے روم میں داخل ہوا۔

مغربی سلطنت رُوم کا خاتمہ

۴۱۰ء کے بعد اطالیہ پر عملاً ویزی گاتھ کی حکمرانی تھی لیکن نام کے لئے ہونوریس بدستور شہنشاہ تھا۔ جرمن فاتحین وحشی تھے اور رومن تہذیب سے اس قدر متاثر تھے کہ ان کے حکمراں اتھالف (Athaulf) نے رومن شہنشاہ کی بہن سے شادی کرنے میں فخر محسوس کیا اور اس رشتے کے سبب

ہونوریس بدستور شہنشاہ رہا -

۴۵۲ء میں اٹلا نے اطالیہ کا رُخ کیا اور پورے شمالی علاقے کو روند ڈالا - اسی سال اٹلا کی موت واقع ہو گئی اور ہن سلطنت جس تیزی کے ساتھ ابھری تھی اسی تیزی کے ساتھ بیٹھ بھی گئی - اٹلا کی موت کے دو سال بعد (۴۵۵ء) میں وینڈال قوم نے طالیہ کو تہ و بالا کر ڈالا - اطالوی شہنشاہ اپنی تذلیل کا انتقام لینے سے قاصر تھا - رومن شہنشاہیت ہچکیاں لے رہی تھی - صرف نام باقی تھا، یہ نام بھی اس وقت جاتا رہا جب اسٹرد گاتھ حکمراں تھیوڈورک (Theodoric) جسے اٹلا نے بے وطن کیا تھا، اطالیہ پر حملہ آور ہوا اور ۴۸۸ء میں اس نے آخری وزیری گاتھ شہنشاہ کو کھلے میدان میں شکست دی اور ۴۹۳ء میں محصور شہر راوینا سے صلح کے بہانے طلب کر کے قتل کر ڈالا -

مغربی سلطنت روما کا چراغ آٹھ صدیوں تک ضوفشاں رہ کر بجھ گیا - مغرب کے حصے بخرے ہو گئے - مشرقی سلطنت روما بازنطین کے نام سے پندرھویں صدی تک قائم رہی تا آنکہ ترک فاتحین نے اسے بھی ۱۴۵۳ء میں ختم کر دیا - (جاری ہے)

نوٹ: تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو - ہنری پائرین کی تاریخ یورپ صفحات ۲۶ تا ۳۰

خیرکم من تعلم القرآن و علمہ

خود پڑھیے اور دوسروں کو پڑھایئے

فی شمارہ چار روپے ــــ سالانہ زرِ تعاون/ ۴۰ روپے
قریبی بک اسٹال سے حاصل کریں یا ہم سے طلب فرمائیں

مکتبہ تنظیم اسلامی ــــ ۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون نمبر- ۸۵۲۶۱۱

اسلام کی انقلابی قدروں کا علمبردار
ماہنامہ میثاق لاہور
مدیر: ڈاکٹر اسرار احمد

تعارف وتبصرہ

عائلی قوانین، شریعت کی روشنی میں

تالیف : مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی

ملنے کا پتہ مجلس دعوت وتحقیق اسلامی علامہ بنوری ٹاؤن کراچی ۵

مسلم پرسنل لاء (عائلی قوانین) کے جو بخیے ایوب خان کی حکومت نے ادھیڑے اور قرآن وسنت کی واضح نصوص کا مذاق اڑایا، اس پر علماء ربانی ہر دور میں مختلف انداز سے صدائے احتجاج بلند کی، سڑکوں پر جلوس نکلے، محضر نامے ارسال کئے گئے، اسمبلی میں آواز بلند ہوئی اور بہت کچھ ہوا لیکن ایوب خان کے بعد، یحییٰ خان، پھر بھٹو صاحب اور اب اسلام کے وفادار سپاہی ضیاء الحق نے جس طرح انہیں تحفظ دیا، وہ اسلامیان پاکستان کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ آج کی شریعت کورٹ تک ان پر غور نہیں کر سکتی، جبکہ ہمارے پڑوس ہندوستان کے ستم رسیدہ مسلمان وہاں کی حکومت کو مجبور کر چکے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے ان معاملات میں مداخلت نہ کرے۔ بہر حال حکومتی سطح پر جو ہوا اور ہو رہا ہے اس کا سارا بار حکومت کے سر ہے، علماء بحمداللہ سرخرو ہیں کہ انہوں نے حق ادا کر دیا۔ مولانا احتشام الحق مرحوم کے اختلافی نوٹ سے لیکر مولانا احمد علی لاہوریؒ کی قیادت میں ہونے والی جدوجہد اور مولانا غلام غوث ہزاروی اور مولانا مفتی محمود کی اسمبلی کے اندر کی کاروائی اللہ تعالیٰ کے حضور ان کی سرخروئی کے لئے کافی ہے اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی زیر نظر مفصل ومبسوط کتاب ہے جو گویا حکمرانوں کے اور اس قماش کے لوگوں پر ایک حجت ہے۔ اس عجالہ نافعہ کو مرتب کیا ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث مولانا حبیب حسن ٹونکی کے خاندان کے فرد مولانا مفتی ولی حسن نے، جو جامع العلام بزرگ ہیں اور خاص طور پر حدیث وفقہ میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ جیسے مرد حُر کے عظیم الشان مدرسہ میں مدت سے حدیث وفقہ اور فقہاء کی خدمت کرنے والے اس انسان نے حکومتی قوانین پر بھرپور

نقد و جرح کی ہے، تفصیل سے بتایا ہے کہ اس کی کون کون سی شق قرآن و سنت کے کس کس حکم سے ٹکراتی ہے ؛ یہ معرکۃ الآراء کتاب اور عظیم الشان علمی ذخیرہ اس قابل ہے کہ کچھ مخیر لوگ آگے بڑھکر قومی / صوبائی / اور سینٹ کے ممبران ، وزراء اور اس قسم کے ذمہ دار لوگوں تک اسے پہنچائیں تاکہ ان کی آنکھیں کھلیں اور سالہا سال سے اس جرم کا شکار ہونے والے حضرات اعتراف جرم کرکے اس سے چھٹکارا حاصل کریں۔ اللہ تعالے حضرت مفتی صاحب کو اجر جزیل سے نوازے اور اہل حل وعقد کو جھوٹی انا سے نکلنے کی توفیق دے

(۲)

شیعہ سنی اتحاد کیسے ممکن ہے ؟

زیر تبصرہ رسالہ مصر کے معروف عالم ربانی السید محب الدین الخطیب رحمہ اللہ تعالے کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے جو عربی اور اردو دونوں زبانوں پر یکساں عبور رکھنے والے بزرگ عالم مولانا عبید الحق ندوی نے کیا ہے اسکی قیمت ۹/- روپے ہے اور اسے مکتبہ علمیہ لیک روڈ لاہور نے شائع کیا ہے - ہمارے خیال میں بقامت کہتر بقیمت بہتر کا مصداق یہ رسالہ اس قابل ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر تقسیم ہوتا کہ سادہ لوح اور بھولے بھالے سنی مسلمان شیعہ حضرات کے پروپیگنڈے کے خول سے نکلے کر اصل حقیقت سے آگاہ ہو سکیں، شیعہ سنی بھائی بھائی اور اتحاد کا نعرہ بڑا حسین ہے یہ نعرہ ایک دور میں مصر میں پھیلا بڑے بڑے اس سے متاثر ہوئے لیکن الخطیب مرحوم نے سارا پردہ چاک کر دیا کہ جن کا سب کچھ ہم سے مختلف ہے وہ ہمارے بھائی کیسے ہو پاکستان میں ایرانی انقلاب کے بعد اس قسم کے شوشے بہت چھوڑے گئے اور چھوڑے جا رہے ہیں حتیٰ کہ اسلامی نظام کی مدعی بعض جماعتوں کے رہنما اس سلسلہ میں سب سے بڑھ کر فتنہ بپا کئے ہوئے ہیں ہو یا تو اس سے واقف نہیں یا دانستہ کسی کے آلہ کار بن کر جماقتوں میں مشغول ہیں — بہر طور اس رسالہ کو کثرت سے پھیلائیں اجتماعی مطالعہ کریں اور سبھی کو اس سے آگاہ کریں کہ یہ وقت کی اہم ضرورت ہے -

سیرتِ نبوی ؐ کے ضمن میں ۲ دو عظیم تحفے

ڈاکٹر اسرار احمد

صدر مؤسس، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور و امیر تنظیمِ اسلامی
کے دروس و تقاریر کے دو مجموعے — اعلیٰ دبیز کاغذ پر خوشنما طباعت کے ساتھ!

رسولِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم

یعنی پاکستان ٹی وی سے نشر شدہ ۱۲ تقاریر کا مجموعہ، اور

فرائضِ دینی اور اسوۂ رسول ؐ

سورۂ احزاب ؐ رکوع ۲، ۳ کی روشنی میں

تبلیغی مقاصد کے پیش نظر — ہدیہ صرف چھ روپے فی کتاب — محصول ڈاک علاوہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور
فون — ۸۵۲۶۱۱
ذیلی دفتر: ۱۱ داؤد منزل، نزد آرام باغ، کراچی ۱ ؛ فون برائے رابطہ ۲۱۴۷۰۹

ں قرآن وسنت کے
علمی ذخیرہ اس قابل
ں، وزراء اور اسی قسم
ب لہا سال سے اس
ٹکارا حاصل کریں۔
ں حل و عقد کو جھوٹی

تبصرہ رسالہ مصر کے
ی کی کتاب کا اردو ترجمہ
ے بزرگ عالم مولانا
ور اسے مکتبہ علمیہ لیک روڈ
ت بہتر کا مصداق یہ رسالہ
ے لوح اور بھولے بھالے
ں حقیقت سے آگاہ ہو
نعرہ ایک دور میں مصر
نے سارا پردہ چاک کر
ہے پاکستان میں ایرانی
ڑے جا رہے ہیں حتیٰ کہ
بڑھ کر فتنہ بپا کئے ہوئے
ی کر حماقتوں میں مشغول
کریں اور سبھی کو اس سے

. 8193
NTHLY
ORE
No. 5